بسم اللہ الرحمن الرحیم

متحدہ مجلسِ عمل

توقعات، کارکردگی اور انجام

ابو عمار
زاہد الراشدی

الشریعہ اکادمی
گوجرانوالہ، پاکستان
www.alsharia.org

جملہ حقوق محفوظ

کتاب : متحدہ مجلس عمل: توقعات، کارکردگی اور انجام
مصنف : ابوعمار زاہد الراشدی
مرتب : محمد عمار خان ناصر
ناشر : الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ
اشاعت : فروری ۲۰۰۸ء

فہرست

پیش لفظ ۵

متوقع ترجیحات اور حکمت عملی

ملک بھر کے دینی حلقوں سے اپیل ۹

متحدہ مجلس عمل کی شاندار کامیابی ۱۳

متحدہ مجلس عمل سے ہماری توقعات ۱۷

مجلس عمل سے وابستہ توقعات ۲۱

مولانا مفتی محمود اور اکرم درانی ۲۵

پاکستان میں نفاذ اسلام کی ترجیحات اور سرحد حکومت کی حکمت عملی ۳۱

پاکستان میں نفاذ اسلام کی ترجیحات ۳۷

سرحد حکومت کی کارکردگی

سرحد حکومت کے اصل کام ۴۷

سرحد حکومت اور شریعت بل ۵۱

شریعت بل، حکومتی کیمپ اور محترمہ بینظیر بھٹو ۵۷

سرحد میں شرعی قوانین کے نفاذ میں درپیش مشکلات ۶۳

قومی خودمختاری کی بحالی۔ ہمارا اصل مسئلہ! ۶۹

طالبائزیشن اور امریکنائزیشن! ۷۳

اسلام کی تعبیر وتشریح اور قائداعظمؒ ۷۹

حسبہ بل پر عدالت عظمیٰ کا نیا فیصلہ ۸۳

رؤیت ہلال پر سرحد اسمبلی کی متفقہ قرارداد ۸۷

رؤیت ہلال کا مسئلہ ۹۱

قومی ایشوز میں ایم ایم اے کا کردار

عراق پر امریکی حملہ اور ایم ایم اے کے مظاہرے ۹۹

ایل ایف او اور متحدہ مجلس عمل کی شرائط ۱۰۳

تحفظ نسواں بل سے متعلق علما کمیٹی کی سفارشات ۱۰۹

'مجلس تحفظ حدود اللہ' کا قیام اور متحدہ مجلس عمل کی ریلی ۱۱۵

تحفظ نسواں بل اور مجلس عمل کا کردار ۱۱۹

دینی جدوجہد کی حکمت عملی اور مجلس عمل ۱۲۵

جامعہ حفصہ کا سانحہ: دینی سیاسی جماعتوں کی ذمہ داری ۱۳۱

عام انتخابات اور متحدہ مجلس عمل کا مستقبل ۱۳۷

معروضی سیاست، عام انتخابات اور مجلس عمل ۱۴۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

نحمدہ تبارك وتعالیٰ ونصلی ونسلم علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا قیام اسلام کے نام پر اور اسلامی نظام کے نفاذ کے وعدے پر عمل میں آیا تھا اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے، جن میں یو پی، مشرقی پنجاب، آسام، بہار اور مغربی بنگال کے مسلمان بطور خاص قابل ذکر ہیں، ایک نظریاتی اسلامی ریاست کی تشکیل کے جذبہ کے ساتھ اس کے لیے بے پناہ قربانیاں دی تھیں، مگر قیام پاکستان کے بعد سے اس مملکت خداداد میں اسلامی نظام کے نفاذ اور قرآن وسنت کے احکام کی عمل داری کا مسئلہ ابھی تک مسلسل سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔

ملک کی متعدد دینی وسیاسی جماعتیں اس سلسلے میں انفرادی اور اجتماعی طور پر سرگرم عمل چلی آرہی ہیں جن میں جمعیۃ علمائے اسلام پاکستان سرفہرست ہے جس نے شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کی قیادت میں تحریک پاکستان میں حصہ لیا اور پھر حضرت مولانا احمد علی لاہوری، حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی، حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی اور حضرت مولانا مفتی محمود کی قیادت میں پاکستان کو ایک اسلامی دستور فراہم کرنے اور ملک میں نفاذ اسلام کے لیے مسلسل جدوجہد کی جواب بھی جاری ہے۔

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات کے بعد صوبہ سرحد میں دینی سیاسی جماعتوں کے مشترکہ محاذ ''متحدہ مجلس عمل'' کی حکومت قائم ہوئی تو نہ صرف ملک بھر کے دینی حلقوں بلکہ پوری دنیا کے خیر خواہ احباب نے اس سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی تھیں جن کا پورا ہونا زمینی حقائق اور ملکی حالات کے معروضی تناظر میں ممکن ہی نہیں تھا۔ چنانچہ اس حوالے سے ایم ایم اے اور اس کی صوبائی حکومت کی کارکردگی قومی وصحافتی حلقوں میں مسلسل زیر بحث رہی اور راقم الحروف بھی وقتاً فوقتاً روزنامہ 'اسلام' اور روزنامہ 'پاکستان' میں اپنے مستقل کالموں اور ماہنامہ 'الشریعہ' اور ماہنامہ 'نصرۃ العلوم' کے ادارتی صفحات میں ان مسائل پر اظہار خیال کرتا رہا۔

عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ نے ان تحریروں کا زیر نظر مجموعہ ترتیب دیا ہے جسے الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے، فجزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ اس سے جہاں اس امر کا اندازہ کرنا آسان ہوگا کہ ایم ایم اے کی سرحد حکومت لوگوں کی توقعات کے مطابق نفاذ اسلام کی طرف موثر پیش رفت کیوں نہیں کر سکی، وہاں مستقبل کے لیے بہتر منصوبہ بندی کی راہیں بھی تلاش کی جا سکیں گی۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت اسے نفاذ اسلام کی جدوجہد میں ایک خدمت کے طور پر قبول فرمائیں اور ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنا دیں۔ آمین یا رب العالمین۔

ابوعمار زاہد الراشدی

۱۸ر دسمبر ۲۰۰۷ء

— ۱ —

متوقع ترجیحات اور حکمت عملی

ملک بھر کے دینی حلقوں سے اپیل

پاکستان شریعت کونسل کا انتخابی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کے قیام کے ساتھ ہی واضح کر دیا گیا تھا کہ پاکستان شریعت کونسل انتخابی سیاست اور اقتدار کی کشمکش سے الگ تھلگ رہتے ہوئے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ، دینی قوتوں میں رابطہ ومفاہمت کے فروغ اور اسلام مخالف لابیوں اور سرگرمیوں کے تعاقب کے لیے فکری اور علمی محاذ پر کام کرے گی، چنانچہ اسی دائرہ میں رہتے ہوئے کونسل اپنے وسائل اور استطاعت کے دائرہ میں سرگرم عمل ہے۔ اس کے ساتھ ہی اعلان بھی کر دیا گیا تھا کہ پاکستان شریعت کونسل کا کوئی بھی رکن یا عہدیدار کسی بھی سیاسی فورم سے انتخابات میں حصہ لے سکتا ہے اور کسی بھی سیاسی جماعت کی رکنیت اختیار کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ وہاں بھی پاکستان شریعت کونسل کے مذکورہ بالا تین مقاصد کے لیے محنت کرتا رہے۔

موجودہ عالمی اور ملکی حالات کے پیش نظر پاکستان کی اسلامی حیثیت اور ملک کے دینی حلقوں اور مراکز کے مستقبل کے حوالہ سے ۱۰/ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات انتہائی اہمیت اختیار کر گئے ہیں، اس لیے اقتدار کی کشمکش سے قطع نظر ملی، قومی و دینی تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان شریعت کونسل کے امیر مولانا فداء الرحمٰن درخواستی اور سیکرٹری جنرل راقم الحروف ابوعمار زاہد الراشدی کی طرف سے حسب ذیل اپیل جاری کی جا رہی ہے۔ ملک بھر کے احباب سے گزارش ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ حضرات تک پہنچانے کی کوشش کریں اور خواص وعوام کو اس موقع پر ان کی دینی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانے کے لیے بھرپور کردار ادا کریں۔

''مکرمی!

السلام وعلیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

گزارش ہے کہ وطن عزیز اسلامی جمہوریہ پاکستان اپنے قیام کے بعد سے ہی عالمی اور ملکی سطح پر اسلام دشمن عناصر کی مکروہ سازشوں کی زد میں رہا ہے اور اس بات کی مسلسل کوشش کی جارہی ہے کہ (۱) پاکستان خودمختاری اور آزادی کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو، (۲) پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت مستحکم نہ ہونے پائے، (۳) پاکستان میں جاگیردارانہ اور نوآبادیاتی استحصالی نظام کے خاتمہ اور اس کی جگہ اسلام کے عادلانہ نظام کے نفاذ کی جدوجہد میں کوئی عملی پیش رفت نہ ہو سکے، (۴) پاکستان معاشی اور عسکری طور پر خودمختار اور باوقار حیثیت نہ حاصل کر سکے، (۵) پاکستان کی دینی قوتوں میں خلفشار کی فضا قائم رہے اور وہ پاکستانی قوم کی قیادت کے لیے اجتماعی کردار ادا کرنے کے قابل نہ رہیں، (۶) پاکستان میں فحاشی اور عریانی پر مشتمل مغربی اور ہندو کلچر کے اثرات کو وسیع سے وسیع تر کر دیا جائے، (۷) پاکستان میں دینی ادارے، مراکز اور شخصیات کی کردارکشی کر کے عوام کو ان سے دور رکھا جائے، (۸) ایک اسلامی نظریاتی ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے پر نمودار ہونے والے پاکستان سے عالم اسلام بالخصوص ملت اسلامی کے دینی حلقوں نے جو توقعات وابستہ کر رکھی ہیں، ان کی تکمیل کی کوئی عملی صورت پیدا نہ ہو، (۹) نئی نسل کو ہر قیمت پر دین اور دینی اثرات سے دور رکھا جائے اور (۱۰) بالآخر پاکستان کو ترکی کی طرح ایک سیکولر ریاست اور معاشرہ کا درجہ دے دیا جائے۔

گزشتہ سال ۱۱ ستمبر کے سانحات کی آڑ میں افغانستان پر امریکی اتحاد کے حملے اور دنیا بھر کی اسلامی تحریکات اور جہادی قوتوں کے خلاف منفی پروپیگنڈے اور اقدامات کے ساتھ اس مہم کو مزید تیز کر دیا گیا ہے اور عالمی استعمار اپنے مقامی معاونین کے تعاون سے پاکستان کو سیکولر ملک کی حیثیت دینے کے ایجنڈے پر تیز رفتاری کے ساتھ اپنے کام کو آگے بڑھا رہا ہے۔ ان حالات میں ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو ہونے والے عام انتخابات انتہائی اہم حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور پاکستان کی اسلامی حیثیت کے تحفظ، وطن عزیز کی خودمختاری اور قومی آزادی کی بحالی اور دینی مراکز کے حوالہ سے یہ

ضروری ہوگیا ہے کہ ملک کا ہر ووٹر اپنی ترجیحات کا از سر نو جائزہ لے اور برادری ازم، دھڑے بندی اور سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر اس الیکشن میں ایسے افراد کو سامنے لانے کے لیے کردار ادا کرے جو دینی سوچ، نظریاتی کردار اور ملی حمیت و غیرت کے حامل ہوں کیونکہ ایسے حضرات ہی موجود بحران سے ملک وقوم کو باوقار طور پر نکال کر خود مختاری، آزادی اور اسلامی تشخص کی شاہراہ پر گامزن کر سکتے ہیں اور اگر خدانخواستہ اس موقع پر بھی دینی تقاضوں اور ملی ضروریات کو قبیلہ، برادری، لوکل دھڑے بندی اور سیاسی وابستگیوں پر قربان کر دیا گیا تو پاکستان کے گرد استعماری نظام کا شکنجہ سخت تر ہوتا چلا جائے گا اور ملک وقوم کی رہی سہی آزادی بھی ختم ہو کر رہ جائے گی۔

یہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ ملک کی دینی جماعتیں ''متحدہ مجلس عمل'' کے نام سے متحد ہو کر ان انتخابات میں قوم کے سامنے آ گئی ہیں اور تمام دینی مکاتب فکر نے اجتماعی دینی قیادت کی عملی شکل ملت کے سامنے پیش کر دی ہے جس سے یہ توقع پیدا ہوگئی ہے کہ اگر اس قیادت کو پاکستان کے عوام نے ۱۰/اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں آگے آنے کا موقع فراہم کیا تو وطن عزیز کو عالمی استعمار کے مفادات اور سازشوں کی دلدل سے نکالنے، نوآبادیاتی استحصالی نظام کے خاتمہ، اسلامی نظام کے نفاذ اور قومی خودمختاری کی بحالی کی کوئی صورت ضرور نکل آئے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس لیے تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام، دینی کارکنوں اور غیور مسلمانوں سے اپیل ہے کہ وہ ۱۰/اکتوبر ۲۰۰۲ء کے الیکشن کو ''ٹیسٹ کیس'' سمجھتے ہوئے اس میں ''متحدہ مجلس عمل'' کے امیدواروں کی کامیابی کے لیے متحرک ہو جائیں اور صرف ووٹ دینے پر اکتفا کرنے کے بجائے اپنے اپنے حلقہ اثر میں ''متحدہ مجلس عمل'' کے امیدواروں کے لیے کام کریں اور انہیں کامیاب بنانے کے لیے مقامی حالات کی روشنی میں جو عملی کردار بھی ادا کر سکتے ہوں، اس سے گریز نہ کریں۔

''متحدہ مجلس عمل'' سے ہٹ کر چند دیگر رہنماؤں کے حوالے سے بھی گزارش کرنا ضروری ہے جن میں راولپنڈی سے محترم راجہ ظفر الحق، کوہاٹ سے حاجی جاوید ابراہیم پراچہ اور جھنگ سے مولانا اعظم طارق بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات اگرچہ ''متحدہ مجلس عمل'' کی طرف سے امیدوار نہیں ہیں لیکن اپنے نظریاتی کردار اور خدمات کے تسلسل میں بھرپور اعتماد کے حامل ہیں اور یہ جس

فورم سے بھی منتخب ہو کر اسمبلی میں پہنچے، ان شاء اللہ تعالیٰ حق کی آواز بلند کریں گے اور حق کا ہی ساتھ دیں گے۔ اس لیے ملک بھر میں ''متحدہ مجلس عمل'' کے امیدواروں کو کامیاب بنانے اور ان کے لیے بھرپور محنت کرنے کی اپیل کے ساتھ ساتھ ان تین حضرات کے حلقوں سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام اور دینی کارکنوں سے بطور خاص گزارش ہے کہ وہ ان کی کامیابی کے لیے ہر ممکن محنت کریں اور ان سے بھرپور تعاون فرمائیں۔

(روزنامہ اسلام مظفر آباد، ستمبر ۲۰۰۲ء)

متحدہ مجلس عمل کی شاندار کامیابی

عام انتخابات کے نتائج نے ایک دنیا کو حیران و ششدر کر دیا ہے اور ان کے بارے میں سب کے سب اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں۔ خود میرا اندازہ یہ تھا بلکہ برطانیہ آمد کے بعد اکثر دوست مجھ سے پوچھتے رہے تو میں ان سے یہی کہتا تھا کہ متحدہ مجلس عمل ۲۰ کے لگ بھگ قومی اسمبلی میں سیٹیں حاصل کر پائے گی اور اگر اسمبلی میں مجلس عمل کی قیادت اسی طرح اکٹھی رہی جس طرح اس الیکشن کمپین میں اس نے یک جہتی کا اظہار کیا ہے اور اگلے انتخابات تک یہ اتحاد قائم رہا تو مجلس عمل کے ملک گیر سطح پر الیکشن جیتنے کی توقع بھی کی جا سکتی ہے۔ اگلے انتخابات کے بارے میں تو میرا اندازہ اب بھی وہی ہے کہ اگر پارلیمنٹ کے اندر مجلس عمل نے ٹیم ورک کا ماحول پیدا کر لیا، اقتدار میں شامل ہونے کی بجائے اپوزیشن میں بیٹھ کر عوامی جذبات کی بے لاگ ترجمانی کی، عوام کے حقیقی مسائل اور قومی خود مختاری کی بحالی کو اپنے ایجنڈے میں اولیت دی اور پارلیمنٹ سے باہر بھی مجلس عمل میں شامل جماعتوں نے عوامی سطح پر اپنے اتحاد و اشتراک کا مظاہرہ مسلسل جاری رکھا تو الجزائر کے اسلامک سالویشن فرنٹ کی طرح پاکستان میں دینی جماعتوں کی متحدہ مجلس عمل بھی اگلے عام انتخابات میں فیصلہ کن اکثریت حاصل کر سکتی ہے، لیکن حالیہ انتخابات کے نتائج خود میرے لیے بھی خوشگوار حیرت کا باعث بنے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ میں گوجرانوالہ شہر اور کراچی کے ایک آدھ پروگرام کے سوا اس انتخابی مہم کو خود اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکا اور اپنے سابقہ تجربہ کے ساتھ ساتھ اخبارات کی خبریں اور تجزیے ہی میری معلومات کا بڑا ذریعہ رہی ہیں۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو، بہر حال مجھے

انتخابات میں ان نتائج کی توقع نہ تھی اور ۱۰/اکتوبر کی شام کو جوں جوں انتخابی نتائج کی تفصیلات معلوم ہوتی گئیں، میری حیرت اور تعجب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے لوگوں کے تعجب اور حیرت میں افسوس، حسرت اور غصہ کا عنصر شامل تھا، لیکن دنیا بھر کے کارکنوں کی طرح میرے تعجب اور حیرت میں خوشی اور تشکر کے جذبات موج زن تھے۔

میں ۱۰/اکتوبر کی شام کراؤلی (برطانیہ) میں مولانا قاری عبدالرشید رحمانی کے ہاں تھا جو استاذ الاساتذہ حضرت مولانا رسول خان ہزارویؒ کے پوتے ہیں اور کراؤلی کی جامع مسجد میں خطیب ہیں۔ جمعیت علمائے برطانیہ کے قاری محمد ہاشم بھی وہیں تھے جو اپنے موبائل فون پر مسلسل معلومات حاصل کر رہے تھے اور مجھے آگاہ کرتے جاتے تھے۔ ان کی خوشی قابل دید تھی اور میری خوشی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا، حتیٰ کہ رات گئے برمنگھم سے مولانا قاری تصورالحق نے مجھے بطور خاص فون کر کے اطلاع دی کہ میرے شہر گوجرانوالہ سے متحدہ مجلس عمل کے امیدوار مولانا قاضی حمیداللہ خان نے بھی قومی اسمبلی کی سیٹ جیت لی ہے تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

متحدہ مجلس عمل کی یہ شاندار کامیابی کہ اس نے قومی اسمبلی میں تیسری بڑی سیاسی قوت کی پوزیشن حاصل کر لی ہے، عام طور پر اس کے دو بڑے سبب بیان کیے جا رہے ہیں۔ ایک کہ یہ افغانستان پر امریکہ کے وحشیانہ حملہ اور طالبان کی مظلوم و معصوم حکومت کی تباہی پر پاکستان کے عوام بالخصوص صوبہ سرحد و بلوچستان کے غیور مسلمانوں کو اپنے غصے کے اظہار کا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا، اس لیے انہوں نے اس الیکشن میں طالبان کی سپورٹ کرنے والی جماعت کو ووٹ دے کر اس غصے کا عملاً اظہار کیا ہے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار مختلف مکاتب فکر کی دینی جماعتوں نے کسی اور سیاسی اتحاد میں شامل ہونے کے بجائے خود اپنا سیاسی اتحاد قائم کر کے جداگانہ تشخص کے ساتھ انتخابات میں حصہ لیا ہے جس کی پاکستان کی عوام کو خوشی ہوئی ہے اور انہوں نے دینی جماعتوں کو ووٹ دے کر اپنی اس خوشی کا برملا اظہار کیا ہے۔

یہ دونوں باتیں درست ہیں۔ متحدہ مجلس عمل کے حق میں اتنی بڑی تعداد میں ووٹ ڈال کر پاکستان کے عوام نے صرف غصہ کا اظہار نہیں کیا بلکہ امریکہ اور اسکے حمایتیوں کو یہ پیغام بھی دیا ہے کہ

ڈیزی کٹرز کی بارش، اقوام متحدہ کی قراردادوں، عالمی برادری کے یک طرفہ موقف اور ورلڈ میڈیا کے مسلسل منفی پروپیگنڈے کے باوجود طالبان اور عرب مجاہدین کے بارے میں ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، وہ اب بھی روسی استعمار کے خلاف افغان عوام کے جہاد آزادی کے منطقی نتائج کی عملی شکل طالبان کی ہی صورت میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں اور خلیج عرب میں امریکی فوجوں کی موجودگی اور اس کی طرف سے اسرائیل کی پشت پناہی کو ناجائز اور سراسر ناانصافی اور ظلم تصور کرتے ہوئے اس کے خلاف اسامہ بن لادن اور ان کے رفقا کی جدوجہد کو جائز اور درست تصور کرتے ہیں۔

خدا جانے مغرب کے ارباب حل وعقد کو یہ غلط فہمی کہاں سے ہوگئی ہے کہ جبر وتشدد اور یک طرفہ پروپیگنڈے کے زور سے قوموں کی رائے تبدیل کی جاسکتی ہے اور ان کے جذبات و احساسات کو دفن کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے غیور شہریوں اور خاص طور پر صوبہ سرحد اور بلوچستان کے عوام نے ایک بار پھر اس حقیقت کا اظہار کر دیا ہے کہ رائے کی تبدیلی کا تعلق طاقت، جبر وتشدد سے نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اور صرف دلیل اور منطق کے ذریعے ہی تبدیل ہوتی ہے۔ عباسی دور خلافت میں قرآن کریم کے مخلوق ہونے کے غلط عقیدہ کو منوانے کے لیے جب حکومت کی طرف جبر سے کام لیا گیا اور حضرت امام احمد بن حنبل پر ان سے یہ منوانے کے لیے کوڑے برسائے گئے کہ وہ اس بات کا اقرار کرلیں کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا مظہر نہیں بلکہ مخلوق ہے تو امام احمد بن حنبل نے برستے کوڑوں میں یہ جواب دیا کہ کوئی دلیل پیش کرو تو سننے اور ماننے کو تیار ہوں، لیکن کوڑوں کی ضرب اور جسم کے لہولہان ہونے کی وجہ سے اپنا عقیدہ اور رائے تبدیل نہیں کرسکتا۔

میرے خیال میں متحدہ مجلس عمل کو ووٹ دینے والے پاکستانی عوام نے بھی اپنے عمل کے ساتھ حضرت امام احمد بن حنبل کے اسی موقف کو دہرایا ہے کہ اقوام متحدہ کی یک طرفہ قراردادوں، عالمی میڈیا کے معاندانہ پروپیگنڈا، طاقت کے استعمال کی دھمکی کے ذریعہ قائم ہونے والے عالمی اتحاد کے فیصلوں اور ڈیزی کٹرز کی بارش سے ہزاروں انسانوں کے جسموں کے پرخچے اڑا کر کسی کو دہشت گرد اور انتہا پسند ثابت نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی باضمیر لوگ عقیدہ اور رائے کے بارے میں ان

''دلیلوں'' کو ماننے کے لیے تیار ہیں۔ اس لیے متحدہ مجلس عمل کے قائدین مولانا فضل الرحمٰن، مولانا شاہ احمد نورانی، قاضی حسین احمد، مولانا سمیع الحق، پروفیسر ساجد میر اور علامہ ساجد نقوی کو اس شاندار کامیابی پر مبارک باد دیتے ہوئے میں متحدہ مجلس عمل کو ووٹ دینے والے غیور پاکستانیوں کو ''سلام عقیدت'' پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے طاقت اور جبر کی دلیل کو ایک بار پھر مسترد کر دیا ہے اور دنیا پر واضح کر دیا ہے کہ پاکستان کے عوام جبر و تشدد اور دباؤ کے حصار میں بھی حق بات کہنے اور حق کی حمایت میں رائے دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ دینی جماعتوں کے متحد ہونے پر اور اپنا جداگانہ سیاسی تشخص قائم کرنے پر پاکستان کے عوام کو خوشی ہوئی ہے تو اس میں بھی شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دینی جماعتوں نے موجودہ اتحاد قائم کرنے کے بعد پہلی کامیابی ووٹرز فارم سے عقیدۂ ختم نبوت کا حلف نامہ حذف کرنے کے خلاف اپنے احتجاج کی پذیرائی کی صورت میں حاصل کی تھی، دوسری کامیابی مدارس دینیہ کے بارے میں حکومتی آرڈیننس کی پسپائی کی شکل میں ان کے حصے میں آئی اور اب تیسری کامیابی بھی انہوں نے دیکھ لی ہے جو صرف کامیابی نہیں بلکہ آئندہ کئی کامیابیوں کی کلید بھی بن سکتی ہے، بشرطیکہ متحدہ مجلس عمل اپنی صفوں میں اتحاد قائم رکھے، پارلیمنٹ کے اندر اور باہر ٹیم ورک کا ماحول پیدا کرے، اقتدار کی دوڑ میں شریک ہونے کے بجائے عوامی جذبات کی ترجمانی اور عوام کے حقیقی مسائل کی نشاندہی کے کردار کو ترجیح دے اور اپنی پالیسیاں اور ترجیحات طے کرتے ہوئے ان مجاہدین اور شہدا کو بھی یاد رکھے جن کے ''مقدس خون'' کی برکت سے متحدہ مجلس عمل کو یہ مقام حاصل ہوا ہے۔

(روزنامہ اوصاف، ۱۶/ اکتوبر ۲۰۰۲ء)

متحدہ مجلس عمل سے ہماری توقعات

[ماہنامہ 'یوتھ کانٹیکٹ' گوجرانوالہ کے دسمبر ۲۰۰۲ء کے شمارے
میں شائع ہونے والے ایک انٹرویو سے اقتباس]

س: پاکستان کے حالیہ عام انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کی کامیابی کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

ج: متحدہ مجلس عمل کو میرے خیال میں دو وجہ سے عوام میں پذیرائی ملی۔ ایک ان کے اتحاد کی وجہ سے کہ پاکستان کی نصف صدی کی تاریخ گواہ ہے کہ دینی حلقوں اور مذہبی مکاتب فکر نے جب بھی متحد ہو کر کسی ملی کاز کے لیے قوم کو آواز دی ہے، قوم نے انہیں کبھی مایوس نہیں کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ گزشتہ سال امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کو ختم کرنے اور اپنی کٹھ پتلی حکومت مسلط کرنے کے لیے جو قیامت ڈھائی ہے اور افغانی عوام کو جس شرم ناک طریقے سے درندگی اور دہشت گردی کا نشانہ بنایا ہے، پاکستان بالخصوص صوبہ سرحد اور بلوچستان کے عوام نے الیکشن میں اس کے خلاف اپنی نفرت اور غصے کا بھرپور اظہار کر دیا ہے اور ان عناصر کے اس منفی پراپیگنڈے کا عملی جواب دیا ہے جو اب تک یہ کہتے آ رہے تھے کہ پاکستان میں دینی جماعتوں کو عوام کی حمایت حاصل نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں اس سے امریکہ اور اس کے سارے حواریوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے اور نوشتہ دیوار پڑھتے ہوئے اپنی پالیسیوں اور طرز عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

س: متحدہ مجلس عمل سے آپ قومی سیاست کے حوالے سے کیا توقعات رکھتے ہیں؟

ج: میرے خیال میں متحدہ مجلس عمل کو مرکز میں اقتدار کی کشمکش میں شریک نہیں ہونا چاہیے تھا اور ۷۳ء کے آئین کے دستور کی بنیادوں کے تحفظ پر اپنی ساری توجہ مرکوز رکھنی چاہیے تھی۔ اس وقت ملک میں حقیقی جمہوریت اور ۷۳ء کے دستور کی بنیادوں کے تحفظ کے لیے سب سے نمایاں اور مضبوط آواز متحدہ مجلس عمل کی ہے۔ اس آواز کے ساتھ اقتدار اور وزارتوں کی خواہش کی آمیزش نہ ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔ بہرحال پھر بھی غنیمت ہے کہ متحدہ مجلس عمل نے اصولوں پر کسی قسم کی سودے بازی نہ کرنے کا اعلان کیا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ متحدہ مجلس عمل کو اس اصولی موقف پر استقامت اور اس میں سرخروئی سے نوازیں کہ:

۱۔ وہ مرکز میں اقتدار کے کھیل سے کنارہ کش رہے اور اپوزیشن میں بیٹھ کر عوام کے جذبات کی ترجمانی کرے۔

۲۔ صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت عوامی مسائل کے حل کے ساتھ اسلامی طرز حکومت کا ایسا نمونہ عملاً پیش کرے جو دوسرے صوبوں کے لیے بھی مشعل راہ ہو اور اگلے الیکشن میں دوسرے صوبوں کے عوام بھی متحدہ مجلس عمل کو موقع دینے پر مجبور ہو جائیں۔

۳۔ متحدہ مجلس عمل کو یہ ووٹ افغانستان کے مظلوم عوام کے خون کی برکت سے ملے ہیں اور عالمی استعمار کی ڈٹ کر مخالفت کرنے کی وجہ سے ملے ہیں، اس حوالے سے مجلس عمل کے موقف اور عملی کردار میں کسی قسم کی کوئی لچک نہیں ہونی چاہیے۔

۴۔ دینی مکاتب فکر کے اتحاد کو ہر قیمت پر قائم رکھا جائے، باہمی ایثار و اعتماد کے ساتھ اس کے دائرہ کار میں وسعت پیدا کی جائے اور اس بات سے ہر وقت چوکنا رہا جائے کہ مخالفین کی طرف سے سب سے زیادہ کوشش یہی ہوگی کہ اس وحدت اور باہمی اعتماد میں کسی نہ کسی طرح دراڑیں ڈال دی جائیں۔

۵۔ صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت ایک علمی کمیشن قائم کرے جو اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے ان میں سے صوبائی اختیارات سے تعلق رکھنے والی

سفارشات کو الگ کرے اوران کے عملی نفاذ کے لیے طریق کار تجویز کرے۔

۶۔ متحدہ مجلس عمل کے وزرا پروٹوکول اور پرسٹیج کے چکروں سے خود کو الگ تھلگ رکھتے ہوئے سادگی، قناعت اور کفایت شعاری کا نمونہ پیش کریں اور اپنے عمل کے ساتھ واضح کریں کہ ایک اسلامی حکومت کے وزرا کس طرح کام کرتے ہیں۔

مجلس عمل سے وابستہ توقعات

پاکستان میں حالیہ انتخابات کے نتائج پر دنیا بھر میں جہاں حیرت کا اظہار کیا جارہا ہے، وہاں مختلف ممالک کے دینی حلقوں اور اسلامی تحریکات میں توقعات اور امیدوں کی ایک نئی لہر بھی ابھری ہے۔ گزشتہ سال افغانستان پر امریکہ کے حملوں اور پاکستان میں طالبان کی حمایت کرنے والی دینی شخصیات اور کارکنوں کی وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کے ساتھ ساتھ جہادی تحریکات کے خلاف کریک ڈاؤن سے مایوسی اور اضطراب کی جو صورت حال پیدا ہوگئی تھی، اس پس منظر میں متحدہ مجلس عمل کی انتخابی کامیابی سے دنیا بھر کی دینی تحریکات کو حوصلہ ملا ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں لندن میں جن شخصیات سے ملاقات وگفتگو کا موقع ملا، ان کے تاثرات پیش خدمت ہیں۔

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کا شمار بھارت کی ممتاز علمی شخصیات میں ہوتا ہے۔ وہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی قدس اللہ سرہ العزیز کے فرزند ہیں۔ ایک مدت سے ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنو کے ایڈیٹر ہیں، صاحب فکر ودانش ہیں، کافی عرصہ سے لندن میں مقیم ہیں۔ ان سے ہر سال لندن میں حاضری پر ملاقات کا موقع ملتا ہے۔ اس دفعہ ملاقات ہوئی تو انھوں نے دریافت کیا کہ انہوں نے ''الفرقان'' میں جو تفصیلی مضمون لکھا ہے، وہ میری نظر سے گزرا ہے یا نہیں۔ یہ مضمون ''الفرقان'' کے اداریے کے طور پر دو قسطوں میں چند ماہ قبل شائع ہوا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں سن رکھا تھا لیکن دیکھ نہیں پایا تھا۔ اس میں انہوں نے طالبان کی پالیسیوں اور سیاسی وفکری طرز عمل پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور اس حسرت کا اظہار کیا ہے کہ افغانستان میں طالبان کی صورت میں ایک مثالی اسلامی

ریاست وحکومت کا جو خواب دنیا بھر کے مسلمانوں نے دیکھا تھا، وہ طالبان قیادت کے خلوص ودیانت اور سادگی وایثار کے باوجود اس کی بعض مسائل میں غلط حکمت عملی کے باعث بکھر کر رہ گیا ہے۔ میں نے ان کے اس ارشاد کے بعد وہ مضمون دیکھا۔ مولانا سنبھلی کا خیال تھا کہ میں ان کے مضمون پر سخت ردعمل کا اظہار کروں گا، مگر میں نے عرض کیا کہ مجھے ان کے موقف سے نہ صرف یہ کہ اصولی طور پر اتفاق ہے بلکہ میں ان کے مضمون کو ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ میں شائع کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہوں۔ مجھے ان لوگوں سے اتفاق نہیں ہے جو طالبان قیادت کو ''معصومیت'' کے مقام پر فائز کر کے ان کی حکمت عملی اور پالیسیوں سے اختلاف کو ''گناہ'' قرار دیتے ہیں۔ میرے خیال میں اہل علم ودانش کو طالبان حکومت کے پانچ سالہ دور کا پوری تفصیل اور گہرائی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے اور خالصتاً علمی اور فکری بنیادوں پر جہاں انہیں کوئی جھول اور غلطی محسوس ہو، اس کی صاف طور پر نشان دہی کرنی چاہیے کیونکہ طالبان اگر افغانستان کے معاملات میں دوبارہ آگے آنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ان کے ذہن میں مستقبل کا کوئی نقشہ ہے تو اصحاب علم ودانش کا یہ بحث ومباحثہ ان کے پیش نظر ہونا چاہیے اور اسے سامنے رکھ کر انہیں اپنی نئی حکمت عملی اور پالیسیاں ترتیب دینی چاہییں۔

البتہ مولانا سنبھلی سے میں نے یہ گزارش کی کہ ان کی اس بات سے مجھے اتفاق نہیں ہے کہ ''خواب بکھر گیا ہے'' اور معاملہ ختم ہو گیا ہے کیونکہ ابھی بہت سے مراحل باقی ہیں، ابھی عشق کے اور بھی کئی امتحان انتظار میں ہیں اور ستاروں سے آگے جہانوں کا سلسلہ ابھی بہت وسیع ہے۔ میرے اندازے کے مطابق ابھی طالبان نے ایک کروٹ لینی ہے اور جہاد افغانستان میں اسلام کی سربلندی کے جذبہ کے ساتھ حصہ لینے والے مجاہدین کی نئی صف بندی ہونی ہے، اس لیے موجودہ صورت حال کو حتمی تصور نہ کیا جائے اور اسے محمود غزنوی کے سومنات پر کیے جانے والے ان سولہ حملوں میں سمجھ لیا جائے جنہیں بعض لوگ ناکام حملے قرار دیتے ہیں لیکن میں انہیں سترھویں اور کامیاب حملے کی تمہید سمجھتا ہوں۔

متحدہ مجلس عمل کی انتخابی کامیابی پر مولانا سنبھلی بہت خوش ہیں، البتہ ان کی رائے یہ ہے کہ متحدہ مجلس عمل کو اپنی تمام تر توجہ صوبہ سرحد کی حکومت پر مبذول رکھنی چاہیے اور وہاں حکومت کا ایسا نمونہ

پیش کرنا چاہیے جو ملک کے دوسرے حصوں کے عوام کے لیے بھی کشش کا باعث بن سکے اور آئندہ انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کی ملک گیر کامیابی کا ذریعہ ثابت ہو۔

ڈاکٹر محمد بن عبداللہ المسعری سعودی عرب کے ان دانشوروں میں سے ہیں جو امریکی فوجوں کی خلیج میں آمد کے موقع پر شاہ فہد کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کرنے کے جرم میں زیر عتاب ہیں۔ وہ ریاض یونیورسٹی کے پروفیسر تھے، اس عرضداشت پر دستخط کرنے کے جرم میں گرفتار ہوئے، کسی طرح جیل سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور یمن کے راستے لندن پہنچ کر سیاسی پناہ لیے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے جذبات کے اظہار کے لیے خود میری تلاش میں تھے۔ ایک روز میری قیام گاہ پر تشریف لائے اور مختلف مسائل پر ان سے تفصیلی بات چیت ہوئی۔ انہوں نے متحدہ مجلس عمل کی کامیابی کو اسلامی قوتوں کی ایک اہم پیش رفت قرار دیا اور کہا کہ متحدہ مجلس عمل کو یہ ووٹ افغانستان میں امریکی مظالم کے ردعمل میں ملے ہیں اور پاکستان کے غیور مسلمانوں نے اپنے جذبات کا اچھے انداز میں اظہار کیا ہے۔ اب اس ووٹ بینک کو سنبھالنے اور اس میں اضافے کے لیے ٹھوس حکمت عملی کی ضرورت ہے اور متحدہ مجلس عمل کو اپنے کام کا دائرہ پھیلانے کے بجائے سرحد اور بلوچستان کو سرگرمیوں کا مرکز بنانا چاہیے۔ اگر صوبہ سرحد کی حکومت کی صورت میں ملک کے عوام کو یہ نظر آ گیا کہ یہ حکومت سابقہ حکومتوں سے مختلف ہے اور حکمرانی کی بجائے عوام کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہے تو پنجاب اور سندھ کے لوگ بھی آئندہ سوچنے پر مجبور ہوں گے لیکن اگر دوسرے صوبوں کی حکومتوں کی طرح صوبہ سرحد کی حکومت بھی روایتی ڈگر پر چلتی رہی اور لوگوں کو کوئی نمایاں عملی فرق دکھائی نہ دیا تو متحدہ مجلس عمل اپنے موجودہ ووٹ بینک کی حفاظت بھی نہیں کر سکے گی۔

ڈاکٹر مسعری نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی اور اسٹیبلشمنٹ اس کے لیے ہر حربہ اختیار کرے گی جس میں فنڈز کی فراہمی میں رکاوٹیں بھی شامل ہیں۔ اس پر قابو پانے کے لیے عوام کو ساتھ ملانا ہوگا اور امداد باہمی کو فروغ دے کر رفاہی اور سماجی کاموں کا دائرہ بڑھانا ہوگا۔ انہوں نے مثال دی کہ الجزائر میں اسلامک سالویشن فرنٹ نے پہلے مرحلہ میں بلدیاتی انتخابات میں کامیابی حاصل کی تھی اور لوکل

حکومتیں بنائی تھیں جنہیں ناکام بنانے کے لیے مرکزی حکومت نے ضروری فنڈز روک لیے مگر اسلامک سالویشن فرنٹ نے اس کی پروا کیے بغیر عام لوگوں سے رضا کارانہ طور پر خدمات سرانجام دینے کی اپیل کی اور فرنٹ کی قیادت خود بھی خدمت گزاروں میں شامل ہوگئی۔ مقامی حکومتوں کے ذمہ دار حضرات عام لوگوں کے ساتھ مل کر گلیوں کی صفائی کرتے اور مختلف شعبوں میں رضا کارانہ خدمات سرانجام دیتے جس کے نتیجے میں انھیں مزید عوامی ہمدردی حاصل ہوئی اور قومی انتخابات میں بھی انھوں نے واضح اکثریت حاصل کر لی۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک مرحلہ میں ان کی واضح کامیابی کے بعد انتخابات کا دوسرا مرحلہ مغربی ملکوں کے دباؤ پر منسوخ کر دیا گیا اور پھر جبر کے ذریعے نہ صرف ان کا راستہ روک دیا گیا بلکہ الجزائر کو بھی خوفناک خانہ جنگی میں دھکیل دیا گیا۔

صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی شاندار کامیابی پر مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی اور ڈاکٹر محمد المسعری جیسے ممتاز دانش وروں کے ان خیالات وتاثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے میں ایم ایم اے کی قیادت کو اس کامیابی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ وہ معروضی سیاست اور روایتی طریق کار کی رو میں بہنے کی بجائے اسلامی نظام کے عملی تعارف اور عوامی ہمدردی کے حصول کے لیے اجتہادی اور انقلابی رویہ اختیار کریں گے تاکہ ان کی یہ کامیابی پاکستان کی قومی سیاست میں دینی حلقوں کی مزید پیش رفت کا ذریعہ بنے اور پاکستان کے عوام اسلامی نظام کے حوالے سے اپنے خوابوں کی عملی تعبیر دیکھ سکیں، آمین۔

(روزنامہ اوصاف، ۱۶ر نومبر ۲۰۰۲ء)

مولانا مفتی محمود اور اکرم درانی

اکرم درانی صاحب سے ممکن ہے کسی موقع پر ملاقات ہوئی ہو مگر مجھے یاد نہیں ہے اور صوبہ سرحد کے وزارت اعلیٰ کے لیے ان کے انتخاب سے قبل اخبارات میں کبھی کبھار ان کا نام پڑھنے کے علاوہ ان کا کوئی تعارف بھی ذہن میں نہیں تھا، اس لیے مجھے متحدہ مجلس عمل کی طرف سے صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ کے منصب کے لیے ان کے چناؤ پر تعجب ہوا کہ اس انتہائی نازک اور حساس موقع پر اس انتہائی اہم منصب کے لیے کسی معروف اور بھاری بھرکم شخصیت کی بجائے ان کا انتخاب آخر کس بنیاد پر کیا گیا ہے؟ رمضان المبارک سے قبل میں برطانیہ میں تھا اور ماہ مبارک کے دوسرے ہفتہ کے دوران وطن واپسی کے بعد سے گوجرانوالہ میں رمضان المبارک کے حوالہ سے مقامی مصروفیات کے حصار میں ہوں جس کی وجہ سے متحدہ مجلس عمل کے قائدین میں سے کسی سے ملاقات بھی ابھی تک نہیں ہو پائی، ورنہ ملاقات کی صورت میں پہلا سوال ذہن میں یہی تھا کہ اکرم درانی کون ہیں اور اتنے اہم اور نازک منصب کے لیے ان کا انتخاب کیسے کر لیا گیا؟ میرا خیال تھا کہ اگر آئینی رکاوٹ نہ ہو تو صوبہ سرحد کا وزیراعلیٰ مولانا فضل الرحمٰن، مولانا سمیع الحق یا قاضی حسین احمد میں سے کسی کو ہونا چاہیے کیونکہ افغانستان کے پڑوس میں متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت کو اپنے منشور پر عملدرآمد بلکہ کاروبار حکومت چلانے میں بھی جن رکاوٹوں اور مشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے اور جن چیلنجوں کے امکانات دن بدن واضح ہوتے جا رہے ہیں، ان سے نمٹنے کے لیے صرف صوبائی اسمبلی میں اکثریت اور اچھے وزرا کی ٹیم کافی نہیں ہوگی، بلکہ حکومتی ٹیم کے کپتان کے طور پر کسی بھاری بھرکم شخصیت کی بھی ضرورت

ہوگی، چنانچہ صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ کے لیے متحدہ مجلس عمل کی طرف سے جناب اکرم درانی کا نام سامنے آنے پر مجھے تشویش ہوئی اور پہلا تاثر ذہن میں یہ ابھرا کہ شاید ایم ایم اے کی قیادت کو صوبہ سرحد کی حکومت کا کاروبار چلانے میں متوقع مشکلات کا پوری طرح احساس نہیں ہے یا وہ اس معاملہ میں اس قدر سنجیدہ نہیں ہے جتنا کہ اسے ہونا چاہیے۔ بھلا ہو برادرم حامد میر صاحب کا کہ انہوں نے اپنے کالم ''قلم کمان'' میں یہ بتا کر میری تشویش ایک حد تک کم کر دی کہ اکرم درانی کا خاندانی تعلق فقیر ایپیؒ کے اس حریت پسند اور مجاہد گروہ سے ہے جس نے ایک عرصہ تک اس خطہ میں برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف جہاد آزادی کا محاذ گرم رکھا اور جس کا نام سامنے آتے ہی حریت اور جہاد کے حقیقی مفہوم سے آشنا مسلمانوں کی گردنیں عقیدت و محبت سے خم ہو جاتی ہیں۔

فقیر ایپی تحریک آزادی کے نامور مجاہدین میں سے تھے اور حامد میر کے بیان کے مطابق اکرم درانی فقیر ایپی کے دست راست حاجی گل نواز کے پوتے ہیں جن کا گھر انگریزوں نے اس جرم میں بموں سے اڑا دیا تھا اور ان کی جائیداد ضبط کر کے کوڑیوں کے مول فروخت کر دی تھی کہ وہ اپنے ملک اور قوم کی آزادی کے لیے ہتھیار اٹھائے ہوئے تھے اور غیر ملکی قابضین سے وفاداری کی اسناد حاصل کرنے کی بجائے ان سے اپنے وطن سے نکل جانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ حاجی گل نواز کا یہ پوتا اگر اپنے عظیم دادا کے ساتھ رشتے کے علاوہ فکری وابستگی بھی رکھتا ہے اور یقیناً رکھتا ہوگا تو میں متحدہ مجلس عمل کو اس حسن انتخاب پر داد دیتا ہوں اور جناب اکرم درانی کو صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے اپنی سیاسی زندگی کے ایک نئے دور کے آغاز پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

اکرم درانی اور ان کی کابینہ نے حلف برداری کے مرحلہ سے گزر کر صوبہ سرحد کا کاروبار حکومت سنبھال لیا ہے اور اب انہیں خود کو اس اعتماد کا اہل ثابت کرنے کے لیے عملی پیش رفت کرنی ہے جس کا اظہار صوبہ سرحد کے عوام نے ۱۰/ اکتوبر کے انتخاب میں کھلے بندوں کیا ہے اور انہیں ان توقعات پر پورا اترنے کے لیے بھی خود کو ہر وقت چوکس رکھنا ہے جو صوبہ سرحد سے باہر نہ صرف پاکستان کے دیندار عوام بلکہ دنیا بھر کی اسلامی تحریکات اور دینی کارکنوں نے صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت سے وابستہ کر لی ہیں۔ میں اس سے قبل ایک مضمون میں اس بات کا تذکرہ کر چکا ہوں کہ

اسلامائزیشن کے حوالہ سے دنیا بھر کے دینی کارکن اور اسلامی تحریکات سب سے زیادہ پاکستان سے توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں ان کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ ۱۰/اکتوبر کے الیکشن کے بعد تین الگ الگ عرب ملکوں سے تعلق رکھنے والے دانشوروں نے مجھے یہ سمجھ کر صوبہ سرحد کا کاروبار بہتر چلانے کے لیے متعدد مشوروں سے نوازا کہ ان معاملات سے شاید میرا ابھی کوئی عملی تعلق ہے یا میں بھی اس سلسلہ میں کوئی کردار ادا کرسکتا ہوں۔ ایک عرب دانشور کا کہنا ہے کہ صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کے وزرائے کرام کو عوام کے روزمرہ مسائل کے حل میں زیادہ دلچسپی لینی چاہیے، ذاتی کردار کے حوالہ سے دیانت، خدمت اور سادگی کی روایات کو زندہ کرنا چاہیے، حکمرانوں اور عوام کے درمیان قائم کیے گئے مصنوعی فاصلوں کو کم کرنا چاہیے اور ایک ایسی دیانت دار، کفایت شعار، خدمت گزار اور باصول حکومت کا نقشہ پیش کرنا چاہیے جو دوسری حکومتوں سے واقعتاً مختلف دکھائی دے اور آئندہ الیکشن میں ملک کے دوسرے صوبوں کے عوام بھی صوبہ سرحد کے عوام کی پیروی کرنے پر مجبور ہوجائیں۔

صوبہ سرحد میں اس سے قبل مولانا مفتی محمود بھی دس ماہ تک وزیر اعلیٰ رہ چکے ہیں۔ ان کا دور اگرچہ عبوری آئین کا دور تھا، ابھی ۷۳ء کا دستور نہیں آیا تھا اور مرکز اور صوبوں کے تعلقات کار اور تقسیم کار کا حتمی طور پر فیصلہ نہیں ہوا تھا جبکہ مفتی صاحب صوبہ میں حکومت کے سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ دستور ساز اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر خان عبدالولی خان کے سرگرم رفیق کار کی حیثیت سے ایک فعال اپوزیشن راہ نما کا کردار بھی ادا کر رہے تھے۔ ان کے حکومتی معاملات میں مرکز کی مداخلت کا یہ حال تھا کہ شراب پر پابندی جیسے مسئلہ پر ان کے پورے دور حکومت میں مرکز ان سے مسلسل خط و کتابت کرتا رہا جس کا مقصد ان پر دباؤ ڈال کر اس معاملہ میں انہیں اپنی پالیسی میں لچک پیدا کرنے پر مجبور کرنا تھا۔

مولانا مفتی محمودؒ نے ہمیں خود بتایا کہ انہوں نے وزارت اعلیٰ کا حلف اٹھاتے ہی جب صوبہ سرحد میں شراب کی تیاری، فروخت اور استعمال پر پابندی لگانے کا اعلان کیا تو مرکز نے ایک مراسلہ میں ان سے کہا کہ شراب کی مد میں صوبائی حکومت کو ٹیکس کی جو آمدنی ہوتی تھی، وہ اس پابندی کی وجہ

سے بند ہوجائے گی اور اس خسارہ کو پورا کرنے کے لیے مرکز ان کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ کوئی بات نہیں، ہم اپنے اخراجات میں کمی کر کے یہ خسارہ پورا کرلیں گے۔ اس کے بعد مرکز کا دوسرا خط آیا کہ غیر مسلموں کے ہاں شراب حرام نہیں ہے، اس لیے ان کے لیے بڑے شہروں میں شراب کی چند دکانیں کھول دینی چاہییں۔ مفتی صاحبؒ نے اس کا جواب دیا کہ غیر مسلموں کو شراب پینے کی اجازت ہوسکتی ہے، لیکن انہیں شراب مہیا کرنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ اس کے بعد مرکز سے تیسرا خط آیا کہ بعض بیماریوں میں شراب بطور دوا استعمال ہوتی ہے، اس لیے گنجایش کی کوئی صورت نکالنا ضروری ہے۔ مفتی صاحب نے اس کے جواب میں صوبائی ہیلتھ سیکرٹری کی سربراہی میں ایک میڈیکل بورڈ بنا دیا اور اس کے ذمے لگایا کہ وہ ایسی بیماری کی نشاندہی کرے جو مہلک ہو اور جس کا شراب کے علاوہ کوئی متبادل علاج نہ ہو۔ مفتی صاحب کا ارشاد یہ تھا کہ اگر واقعی ایسی کوئی بیماری موجود ہے جو مہلک ہے اور شراب کے علاوہ اس کا کوئی متبادل علاج نہیں ہے تو وہ ایسی بیماری کے لیے ہسپتالوں میں شراب کے استعمال کی اجازت دینے کے لیے تیار ہیں، لیکن میڈیکل بورڈ کی رپورٹ یہ تھی کہ ایسی کوئی بیماری سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

مولانا مفتی محمودؒ نے اس طرح کی رکاوٹوں، مشکلات اور مداخلت کے باوجود نہ صرف کاروبار حکومت کامیابی کے ساتھ چلایا بلکہ مرکز میں اپوزیشن راہ نما کا رول بھی باوقار طریقہ سے نبھایا، سادگی اور کفایت شعاری کا نقشہ پیش کیا اور پھر اصولوں کی خاطر از خود اقتدار سے الگ ہو کر دنیا کو بتا دیا کہ اہل حق اور اہل دین کے نزدیک اقتدار مقصد نہیں بلکہ مقاصد کے حصول کے لیے صرف ایک ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

جناب اکرم درانی نے مولانا مفتی محمود کی یہ سیٹ سنبھالی ہے اور خوش قسمتی سے ان کا تعلق بھی مفتی صاحب ہی کی جماعت سے ہے، اس لیے لوگ ان سے بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے نہ صرف مولانا مفتی محمود کی روایات کو زندہ کریں گے بلکہ ان کے مشن کو عملاً آگے بڑھانے کے لیے بھی سنجیدہ محنت کریں گے۔ مفتی صاحب کی پشت پر تو مینڈیٹ بھی اتنا بڑا نہیں تھا اور چالیس کے ایوان میں ان کی اپنی پارٹی کی سیٹیں صرف چھ تھیں، باقی سب کچھ

ان کی حکمت وتدبر کا کرشمہ تھا۔ اکرم درانی ان سے کہیں زیادہ بھاری مینڈیٹ کے ساتھ حوصلہ اور اعتماد کے ساتھ اپنے منشور کی طرف پیش رفت کر سکتے ہیں، البتہ ''حکمت وتدبر'' کے بارے میں انہیں مولانا مفتی محمود ہی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور انہی سے راہ نمائی حاصل کرنا ہوگی۔ اگر انہوں نے ایسا کرنے کا اہتمام کرلیا تو ان شاء اللہ تعالیٰ متحدہ مجلس عمل اپنے ووٹروں کے ہاں سرخرو ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مشن اور منشور کے ساتھ بھی صحیح طور پر انصاف کر سکے گی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس میں کامیابی اور سرخروئی عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، ۱۰ر دسمبر ۲۰۰۲ء)

پاکستان میں نفاذ اسلام کی ترجیحات
اور سرحد حکومت کی حکمت عملی

گزشتہ دنوں لاہور کے ہمدرد سنٹر میں ایک سیمینار میں شرکت کا موقع ملا۔ اس سیمینار کا اہتمام ''مجلس فکر ونظر'' نے کیا تھا جو پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامی کے اساتذہ نے اگست ۲۰۰۰ء سے قائم کر رکھی ہے اور اس کے تحت عصری مسائل پر اسلامی تناظر میں غور وفکر کے لیے سہ ماہی علمی مجالس کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ سیمینار کا موضوع ''پاکستان میں نفاذ اسلام کی ترجیحات'' تھا۔ اس میں متحدہ مجلس عمل کے رہنما حافظ حسین احمد ایم این اے اور صوبہ سرحد کی متحدہ مجلس عمل کے نائب صدر پروفیسر محمد ابراہیم مہمانان خصوصی تھے جبکہ مجھے شاید اس خیال سے صدارت کی کرسی پر بٹھا دیا گیا تھا کہ کہیں درمیان میں اٹھ کر چلا نہ جاؤں جیسا کہ عام طور پر ایسا ہو جاتا ہے۔

سیمینار میں ''مجلس فکر ونظر'' کے سیکرٹری پروفیسر ڈاکٹر محمد امین نے مجلس کے اغراض ومقاصد اور سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور سیمینار کے سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف پنجاب یونیورسٹی کے اردو دائرہ معارف اسلامیہ (اسلامی انسائیکلو پیڈیا) کے سینئر ایڈیٹر ہیں اور علمی وادبی حلقوں میں نمایاں تعارف رکھتے ہیں۔ تحریک اسلامی پاکستان کے امیر حکیم سید محمود احمد سرو سہارنپوری، ریٹائرڈ جسٹس عبد الحفیظ چیمہ، بادشاہی مسجد لاہور کے خطیب پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن عارف، پروفیسر عبد الجبار شاکر، جناب کے ایم اعظم، پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ ابلاغیات کے ڈاکٹر مغیث الدین شیخ اور دیگر ارباب دانش نے نفاذ اسلام کی اہمیت اور اس کی حکمت عملی کے حوالے سے

مختلف امور پر اظہار خیال کیا اور حافظ حسین احمد اور پروفیسر محمد ابراہیم نے اس سلسلے میں متحدہ مجلس عمل کی حکمت عملی، صوبہ سرحد اور بلوچستان کی تازہ ترین صورت حال اور دونوں صوبائی حکومتوں کے عزائم پر روشنی ڈالی۔

حافظ حسین احمد صاحب نے تفصیل کے ساتھ گفتگو کی اور شرکائے مجلس نے گہری توجہ کے ساتھ ان کی باتوں کو سنا جو متحدہ مجلس عمل کی پالیسیوں اور طریق کار کی وضاحت پر مشتمل تھی۔ مجھ کافی عرصہ کے بعد حافظ صاحب کی تفصیلی اور سنجیدہ گفتگو سننے کا موقع ملا اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ پہلے کی نسبت زیادہ متانت اور استدلال کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اعلیٰ ذہانت کے سامنے غور وفکر کے نئے پہلو رکھنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہیں۔ ان کی گفتگو کے اختتام پر ایک ممتاز دانش ور اور فاضل دوست نے اس بات پر زور دیا کہ اس قسم کی مجالس کا اہتمام ملک کے ہر بڑے شہر میں ہونا چاہیے۔ متحدہ مجلس عمل کے قائدین کو حافظ حسین احمد کی طرح ایسی مجالس میں ارباب علم ودانش کے درمیان بیٹھ کر انھیں اپنی پالیسی اور طریق کار کے بارے میں بریف کرنا چاہیے اور چاروں طرف پھیلے ہوئے شکوک وشبہات کے ازالہ کے لیے محنت کرنی چاہیے۔

خود میں اس حوالے سے کافی دنوں سے کنفیوژن کا شکار تھا کہ دستور پاکستان کی ترمیم شدہ اور بحال کی جانے والی دفعات کی روشنی میں اس وقت وفاق اور صوبوں کے تعلقات کار کی نوعیت کیا ہے اور صوبائی حکومتیں دستور میں دیے گئے کون سے اختیارات کو استعمال کرنے کی پوزیشن میں ہیں؟ حافظ حسین احمد کی گفتگو سے بات صاف ہوئی اور معلوم ہوا کہ جس طرح وفاق میں پارلیمنٹ اور کابینہ دونوں اپنے دستوری اختیارات کے استعمال کے لیے ''فرد واحد'' کے اشاروں کے محتاج ہیں، اسی طرح صوبائی حکومتوں اور اسمبلیوں کا حال بھی ان سے مختلف نہیں ہے اور جس طرح آج کے عالمی نظام اور ورلڈ سسٹم میں دنیا کے کسی کونے میں کوئی اہم کام امریکا کی مرضی کے بغیر نہیں ہو پاتا، اسی طرح پاکستان کے نئے داخلی نظام میں بھی قومی زندگی کے کسی شعبے کا کوئی اہم کام ایوان صدر کے این او سی کے بغیر نہیں ہو سکے گا۔

مجھے تو یہ بات اسی دن کھٹک گئی تھی جس روز پی سی او کے تحت عدالت عظمیٰ کے جج صاحبان

سے نیا حلف لینا ضروری سمجھا گیا تھا اور میں نے اپنے ایک مضمون میں عرض کر دیا تھا کہ یہ شخصی وفاداری کا حلف ہے جس کے بعد پاکستان ایک طرح کی بادشاہت کے دور میں داخل ہو گیا ہے، مگر ہمارے بہت سے دانش وروں کے اصرار تھا کہ اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے اور ملک کے نظام کی ''اصلاح'' کے لیے اس کڑوی گولیل کو وقتی طور پر نگل لینا ہماری مجبوری ہے، مگر آج وہی دانش ور اور کالم نگار عدالت عظمیٰ کے جج صاحبان کو دستور کے تحت نیا حلف دلانے پر زور دے رہے ہیں اور اس کے لیے اپنا پورا زور قلم صرف کر رہے ہیں جبکہ مجھے اس پر پنجابی کا ایک مشہور محاورہ یاد آ رہا ہے کہ ''ویلے دی نماز تے کویلے دیاں ٹکراں''، یعنی نماز کو اس کے وقت میں اہتمام کے ساتھ پڑھا جائے تو وہ نماز ہوتی ہے لیکن اگر اس کا وقت گزر جائے اور اس کے بعد نماز کو جلدی جلدی نمٹانے کی کوشش کی جائے تو وہ ''ٹکریں'' بن جاتی ہے۔

حافظ صاحب نے ''ترجیحات'' کے لفظ سے اختلاف کیا اور کہا کہ دین مکمل ہو جانے کے بعد اس کے نفاذ کے لیے ترجیحات کی بات کرنا درست نہیں اور پھر یہ ترجیحات تو ہم گزشتہ پچپن برس میں بھی نہیں طے کر پائے، اس لیے وہ اس کے لیے ترجیحات کے بجائے ''حکمت عملی'' کی اصطلاح کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ دین کو مکمل طور پر نافذ کیا جائے گا تو وہی دین ہوگا۔ کسی نامکمل کام پر نفاذ اسلام کا اطلاق کرنا ٹھیک نہیں ہوگا، البتہ اس کے لیے ہمیں صحیح حکمت عملی اور طریق کار کا ضرور جائزہ لینا چاہیے اور ہم اس کے لیے قدم قدم پر اہل علم و دانش کے مشورہ اور راہ نمائی کے محتاج ہیں۔

پروفیسر محمد ابراہیم نے سرحد کی صوبائی حکومت کے عزائم اور اس کی راہ میں حائل مشکلات کا جائزہ پیش کیا اور کہا کہ ہم پوری احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے ہیں اور ہمیں ان مشکلات اور رکاوٹوں کا پوری طرح ادراک و احساس ہے جو نفاذ اسلام کی طرف عملی پیش رفت میں حائل ہو سکتی ہیں، لیکن دینی جماعتوں کے اتحاد اور رائے عامہ کی بھرپور حمایت کی وجہ سے ہمیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مشکلات سے ہمیں ضرور نجات دلائیں گے اور ہم اپنے منشور اور اعلانات کے مطابق اپنی استطاعت اور اختیارات کے دائرے میں رہتے ہوئے صوبہ سرحد میں نفاذ اسلام کے لیے کچھ نہ کچھ کام ضرور کر سکیں گے۔

سیمینار کے مقررین کا زیادہ زور اس بات پر رہا کہ متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت کو عوام کی مشکلات میں کمی اور ان کے روزمرہ مسائل کے حل کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے، وی آئی پی اور پروٹوکول کلچر کے جال سے نکلتے ہوئے سول سروس کو عوام کا خادم بنانا چاہیے کیونکہ عام آدمی کا یہ اعتماد بحال کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے کہ اسلامی نظام نافذ ہونے کی صورت میں اس کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت ہوگی، اس کی مشکلات کم ہوں گی، باعزت زندگی کے مواقع فراہم ہوں گے، اس کے روزمرہ مسائل حل ہوں گے، اسے انصاف ملے گا اور وہ پہلے سے زیادہ بہتر ماحول میں زندگی گزار سکے گا۔

راقم الحروف نے اپنی گزارشات میں یہ عرض کیا کہ موجودہ معروضی حالات میں نفاذ اسلام کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے تین امور کا اہتمام ضروری ہے۔ ان میں سے پہلے دو کام ہم سب کے کرنے کے ہیں اور ان کے لیے ملک کے ہر اس شہری کو عملی کردار ادا کرنا چاہیے جو پاکستان میں نفاذ اسلام کا خواہاں ہے، جبکہ تیسرا کام صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت کے کرنے کا ہے اور اسے بھی پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

☆ قیام پاکستان کے بعد سے ہی نفاذ اسلام کے عمل کے گرد دو سرخ دائرے کھینچ دیے گئے تھے جو کچھ عرصہ پہلے تک ظاہری طور پر نظر نہیں آتے تھے لیکن اب ہر ذی شعور شہری کو دکھائی دینے لگے ہیں۔ ایک سرخ دائرہ ملک کی داخلی اسٹیبلشمنٹ کا کھینچا ہوا ہے جو نفاذ اسلام کی کسی بھی عملی کوشش کو روکنے اور محدود رکھنے کے لیے ہے اور دوسرا دائرہ ورلڈ اسٹیبلشمنٹ نے اس کے اوپر قائم کر رکھا ہے کہ اگر کسی وقت نفاذ اسلام کی کوئی کوشش عوامی دباؤ کی وجہ سے پہلے سرخ دائرے کو کراس کر ہی لے تو اسے دوسری دفاعی لائن پر روک لیا جائے۔ چنانچہ گزشتہ نصف صدی کے دوران پاکستان میں نفاذ اسلام کی ہر کوشش کے ساتھ چوہے بلی کا یہی کھیل جاری ہے۔ اس لیے نفاذ اسلام کے حوالے سے ہماری سب سے پہلی اور اولین ضرورت ان سرخ دائروں سے نجات حاصل کرنا ہے، کیونکہ ان کے ہوتے ہوئے نفاذ اسلام کا کوئی قدم بھی کامیابی کی طرف اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکے گا اور ان منحوس سرخ

دائروں سے نجات حاصل کرنے کے لیے قومی سطح پر جدوجہد اور رائے عامہ کو ملک گیر سطح پر منظّم کرنے کی ضرورت ہے جس کے لیے ہم سب کو اپنے اپنے دائرۂ کار میں متحرک ہونا پڑے گا۔

☆ اسلامی نظام اور قوانین کے خلاف عالمی لابیوں اور عالمی ذرائع ابلاغ کی منفی مہم اور معاندانہ پراپیگنڈے کے توڑ کے لیے علمی مراکز، دینی اداروں اور فکری حلقوں کو مربوط اور منظّم محنت کرنی چاہیے اور یہ بھی ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

☆ صوبہ سرحد کی حکومت کو دستوری ماہرین کی مشاورت سے موجودہ دستوری صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے دائرۂ اختیار کا تعین کرنا چاہیے اور جن اختیارات کو وہ موجودہ حالات میں استعمال کرسکتی ہے، ان سے متعلقہ معاملات کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو منتخب کر کے صوبائی اسمبلی کے ذریعے سے ان پر قانون سازی کا آغاز کر دینا چاہیے۔

میرے خیال میں صوبہ سرحد کی حکومت سردست صرف یہی کرسکتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت اور صوبائی اسمبلی اپنے بس کا کام کر گزرے گی تو اگلے مراحل کا راستہ بھی اللہ تعالیٰ ضرور آسان فرما دیں گے کہ اس قادر مطلق کا قانون وضابطہ یہی ہے۔

(روزنامہ اسلام، ۲۹ جنوری ۲۰۰۳ء)

پاکستان میں نفاذ اسلام کی ترجیحات

[۲۱ جنوری ۲۰۰۳ء کو ہمدرد سنٹر لٹن روڈ لاہور میں ''مجلس فکر ونظر'' کے زیر اہتمام ''پاکستان میں نفاذ اسلام کی ترجیحات'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار میں پڑھا گیا۔]

نحمده تبارك وتعالىٰ ونصلي ونسلم علىٰ رسوله الكريم وعلىٰ آله وأصحابه وأتباعه أجمعين۔

نفاذ اسلام کی جدوجہد کے ایک نظریاتی کارکن کی حیثیت سے مجھے یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی میں اسلامی علوم کی تعلیم وتدریس سے متعلق اساتذہ نے اگست ۲۰۰۰ء سے ''مجلس فکر ونظر'' کے نام سے ایک علمی فورم قائم کر رکھا ہے جس میں عصری مسائل پر اسلامی تناظر میں غور کیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان بننے کے بعد سے اب تک نفاذ اسلام کے علمی وفکری تقاضوں اور عصری مسائل کے اسلامی تناظر میں تجزیہ وحل کے لیے غیر سرکاری سطح پر کوئی اجتماعی کام منظم نہیں ہو سکا اور اگرچہ اس حوالہ سے شخصی حوالوں سے اچھا خاصا کام سامنے آیا ہے مگر شخصی فکر اور عقیدت کے دائروں میں محدود ہونے کی وجہ سے قوم کی اجتماعی زندگی میں اس کے خاطر خواہ ثمرات مرتب نہیں ہو سکے اور نفاذ اسلام کے محاذ پر علمی وفکری ہوم ورک کا خلا بدستور ارباب علم ودانش کو کھٹک رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ جس طرح قیام پاکستان کے فوراً بعد تمام مکاتب فکر کے ۳۱ سرکردہ علماء کرام نے ۲۲ دستوری نکات مرتب کر کے نفاذ اسلام کے حوالہ سے اجتماعی علمی سوچ اور فکر کا عملی مظاہرہ کیا تھا، اس کا تسلسل قائم رہتا اور اسی جذبہ اور شعور کے ساتھ عصری مسائل کے حل کے ساتھ

ساتھ نفاذ اسلام کی راہ میں حائل رکاوٹوں اور مشکلات سے نمٹنے کی علمی جدوجہد کی جاتی لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوسکا اور ہماری نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط قومی زندگی میں علماء کرام کے مذکورہ ۲۲ متفقہ دستوری نکات کے بعد اگر کوئی اجتماعی علمی کاوش نظر آتی ہے تو وہ ۷۳ء کے دستور میں اسلامی دفعات کی شمولیت، قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے، صدر ضیاء الحق مرحوم کے دور میں وفاقی شرعی عدالت کے قیام، حدود آرڈیننس کے نفاذ اور اس نوعیت کے دیگر چند اقدامات تک محدود ہے یا اس سلسلہ میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور وفاقی شرعی عدالت کے متعدد فیصلوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے مگر جب ہم نفاذ اسلام کے سلسلہ میں عالمی سطح پر پائے جانے والے ہمہ گیر شکوک و شبہات اور مختلف عالمی حلقوں کی تشویش و اضطراب کے تناظر میں نفاذ اسلام کی اصل علمی و فکری ضروریات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ کام قطعی طور پر ناکافی دکھائی دیتا ہے۔ بالخصوص جدید علمی و فکری چیلنجز کے پس منظر میں اجتماعی علمی و فکری جدوجہد کا خلا پوری شدت کے ساتھ اپنے وجود کا احساس دلاتا رہتا ہے۔

میری ایک عرصہ سے یہ کوشش اور خواہش رہی ہے کہ قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کی تعلیم و تدریس کے ساتھ گہرا تعلق رکھنے والے علما اور جدید علوم و فنون بالخصوص قانونی نظام سے تعلق رکھنے والے ارباب دانش کے مشترکہ علمی فورم تشکیل پائیں اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے طرز اجتہاد کا احیا کرتے ہوئے مسائل کے تجزیہ و تحلیل اور حل کے لیے مشاورتی طریق کار کا راستہ اختیار کیا جائے لیکن متعدد مواقع پر اس کے لیے آواز اٹھانے اور متعلقہ حضرات کو توجہ کے باوجود پیش رفت کی کوئی صورت دکھائی نہیں دی۔ اس پس منظر میں ''مجلس فکر و نظر'' کے قیام پر مجھے جس قدر خوشی ہو سکتی ہے، اسے الفاظ میں بیان کرنا مجھے مشکل محسوس ہو رہا ہے تاہم اس میں یہ کمی میرے خیال میں ابھی تک موجود ہے کہ دینی مدارس کے سینئر اساتذہ اور قانونی شعبہ سے تعلق رکھنے والے ماہرین سے استفادہ کی شاید ضرورت محسوس نہیں کی گئی یا ان سے رابطہ کا کوئی قابل عمل طریقہ طے نہیں پا سکا۔ لیکن اس حوالہ سے اپنے احساسات و تاثرات کے اظہار پر خود کو مجبور پا رہا ہوں اور اس پر ''مجلس فکر و نظر'' سے معذرت خواہ ہوں۔

جہاں تک پاکستان میں نفاذ اسلام کی ترجیحات پر گفتگو کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اب تک ہونے والے کام پر ایک نظر ڈال لی جائے تو آئندہ ترجیحات پر غور ہمارے لیے آسان ہو جائے گا۔

☆ ملک کے دستور کی بنیاد ''قرارداد مقاصد'' پر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کو تسلیم کر کے قرآن وسنت کی حدود میں رہتے ہوئے عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ ملک کا نظام چلانے کی ضمانت دی گئی ہے۔ اسی حوالہ سے یہ ملک ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کہلاتا ہے اور اسی بنیاد پر پاکستان کو ایک نظریاتی اسلامی ریاست کا مقام حاصل ہے۔

☆ دستور میں اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے۔

☆ قرآن وسنت کے منافی قوانین نافذ نہ کیے جانے اور تمام قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالنے کا دستوری وعدہ کیا گیا ہے۔

☆ مروجہ قوانین کی اسلامی حیثیت کے تعین کے لیے وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل کے نام سے دو دستوری ادارے کام کر رہے ہیں۔

☆ اسلامی نظریاتی کونسل ملک کے تمام مروجہ قوانین کا جائزہ لے کر انہیں قرآن وسنت کے مطابق ڈھالنے کے لیے ایک جامع رپورٹ پیش کر چکی ہے۔

☆ وفاقی شرعی عدالت نے متعدد قوانین کے بارے میں واضح فیصلے صادر کر رکھے ہیں۔

☆ قومی اسمبلی اور سینٹ آف پاکستان مختلف مواقع پر قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لا قرار دینے کا بل الگ الگ طور پر منظور کر چکی ہیں۔

مگر اس سب کچھ کے باوجود نفاذ اسلام کی دلّی ابھی بہت دور ہے اور اس کے قریب آنے کا سردست کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ملک کا موجودہ نظام جن طبقات کی گرفت میں ہے اور جو گروہ پاکستان کے مروجہ سسٹم کا کنٹرول پوری قوت کے ساتھ اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے ہیں، ان میں سے کوئی طبقہ بھی نفاذ اسلام کے لیے سنجیدہ نہیں ہے اور وہ اسے قوم کو بہلانے کے لیے ایک کھلونے سے زیادہ کوئی حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس طبقہ

میں سول اور ملٹری بیوروکریسی کے ساتھ جاگیردار اور اعلیٰ مراعات یافتہ گروہ بھی شامل ہیں اور انہیں پاکستان میں نفاذ اسلام کا ہر قیمت پر راستہ روکنے کے لیے عالمی استعمار اور ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کی بھرپور حمایت اور پشت پناہی حاصل ہے۔ اس لیے میرے نزدیک نفاذ اسلام کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعتوں اور طبقات کی ترجیحات میں سب سے پہلے اس بات کو اہمیت حاصل ہونی چاہیے کہ مروجہ نظام کی حفاظت کے لوکل اور ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کے قائم کردہ حصار اور ریڈ لائن کو کیسے توڑا جائے؟ کیونکہ اس حصار کو توڑے بغیر اور مروجہ نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ کیے بغیر نفاذ اسلام کا کوئی سنجیدہ قدم آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ ہی نظام میں تبدیلی کی کوئی کوشش کامیاب ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد تاریخ اسلام سے دو تین مواقع کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جب چند نیک دل حکمرانوں کو بگڑے ہوئے نظام کی اصلاح کا موقع ملا اور انہوں نے اس بگڑے ہوئے نظام کی اصلاح کے لیے پوری دیانت داری کے ساتھ پیش رفت کی۔ ہو سکتا ہے ان کے اقدامات اور طرز عمل سے ہمارے لیے راہ نمائی کا کوئی راستہ نکل آئے۔

پہلے نمبر پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں جنہوں نے پہلی صدی ہجری کے اختتام پر خلافت کی ذمہ داری قبول کی جبکہ ملکی نظام میں خاصا بگاڑ آ چکا تھا۔ عوامی حاکمیت کی بجائے حکمران طبقہ وجود میں آ گیا تھا۔ وی آئی پی کلچر نے مسلمان سوسائٹی میں اپنی جگہ بنالی تھی اور قومی خزانے کی لوٹ کھسوٹ کا یہ عالم تھا کہ بعض مؤرخین کے بقول بیت المال یعنی قومی خزانے کے اسی فی صد اموال اور اثاثے شاہی خاندان اور مراعات یافتہ طبقوں کی تحویل میں تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے برسر اقتدار آنے کے بعد اس صورت حال کی اصلاح کے لیے جو اقدامات کیے، ان کی فہرست طویل ہے لیکن ان میں چند اہم اقدامات یہ ہیں:

☆ قومی خزانے کی رقوم اور اثاثوں کی واپسی کا آغاز اپنی ذات اور گھر سے کیا اور پھر کسی رو رعایت کے بغیر تمام متعلقہ لوگوں سے قومی خزانے کی رقوم اور اثاثے سختی کے ساتھ واپس لے لیے۔

☆ سابق حکمرانوں نے رعایا پر جو ناجائز ٹیکس عائد کر رکھے تھے، وہ ختم کر دیے اور عام لوگوں کو

سرکاری عمال کی لوٹ کھسوٹ سے نجات دلائی۔

☆ وی آئی پی کلچر کا خاتمہ کیا اور پروٹوکول اور پرسٹیج کے ضابطے ختم کر دیے۔

☆ خود بھی عام لوگوں جیسی سادہ زندگی اور رہن سہن اختیار کیا اور دوسرے سرکاری حکام کو بھی عام لوگوں جیسے معیار زندگی کی طرف واپس آنے پر مجبور کیا۔

☆ قانون کی عملداری بحال کی اور سرکاری عمال کو پابند کیا کہ وہ کسی شخصیت' طبقہ یا خاندان کی پروا کیے بغیر قرآن وسنت کے مطابق تمام امور کے فیصلے کریں۔

چھٹی صدی ہجری میں ایک نیک دل حکمران سلطان نور الدین زنگیؒ نے شام کی حکومت کا کنٹرول حاصل کیا تو اسے بھی ایک بگڑے ہوئے نظام کا سامنا تھا اور اس نے اصلاح احوال کے لیے جو طریقے اختیار کیے، ان میں سے چند ایک کا مؤرخین اس طرح ذکر کرتے ہیں:

☆ جزیہ اور خراج کے سوا تمام ٹیکس منسوخ کر دیے۔

☆ عام ضرورت کی تمام اشیا کو چونگی اور ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔

☆ منکرات وفواحش اور بدکاری و بے حیائی کے خاتمہ کے لیے سخت گیر پالیسی اختیار کی۔

☆ سرکاری خرچ پر مفت شفاخانہ قائم کیا۔

☆ دمشق میں علم حدیث کی تعلیم کے لیے مستقل مدرسہ قائم کیا جو عالم اسلام کا پہلا ''سرکاری دار الحدیث'' کہلاتا ہے اور جس کے شیخ الحدیث معروف محدث حافظ ابن عساکرؒ تھے۔

☆ خراسان کے معروف ریاضی دان قطب الدین نیشاپوریؒ کو دمشق میں بلوا کر بڑی درسگاہ قائم کی۔

بارہویں صدی ہجری کے دوران جب ہندوستان میں مغل بادشاہت کا چراغ بتدریج گل ہو رہا تھا، جنوبی ہند کی ریاست میسور میں سلطان ٹیپوؒ نے اقتدار سنبھالا تو اسے ایک زوال پذیر معاشرے سے سابقہ درپیش تھا اور وہ جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار کے تیزی سے بڑھتے ہوئے قدموں کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس نے میسور کی سلطنت خداداد کو ایک خوشحال اور مستحکم اسلامی ریاست بنانے کی ہر ممکن کوشش کی' تجارت وزراعت کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ دفاع اور

اسلحہ سازی کی طرف خصوصی توجہ دی اور جہاز سازی کے میدان میں پیش رفت کر کے عسکری قوت میں فرنگی استعمار کے بالمقابل آنے کا عزم کیا۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ اگر ٹیپو شہیدؒ کو اس کی خواہش کے مطابق ترکی کی خلافت عثمانیہ کی سرپرستی حاصل ہو جاتی اور میسور کی پڑوسی مسلم ریاستیں اس کے مقابلہ میں فرنگی حکمرانوں کا ساتھ نہ دیتیں تو سلطان ٹیپوؒ کی حکمت عملی اور عزم میں اتنی قوت تھی کہ وہ جنوبی ایشیا کے ایک بڑے حصے کو برطانوی استعمار کے نوآبادیاتی تسلط سے آزاد رکھنے میں کامیاب ہو جاتا۔ مگر خلافت عثمانیہ اور ریاست حیدرآباد دونوں نے اس مرد غیور کا ساتھ دینے اور اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھنے کے بجائے انگریزوں کا ساتھ دینے کو ترجیح دی جس کی وجہ سے نہ صرف سلطان ٹیپو کو جام شہادت نوش کرنا پڑا بلکہ جنوبی ایشیا کی یہ اسلامی ریاست بھی تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہوگئی۔

ہمیں پاکستان میں اس سے کہیں زیادہ سنگین صورت حال درپیش ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اور سلطان نورالدین زنگیؒ کے سامنے ایک بگڑے ہوئے نظام کی اصلاح کا مشن تھا جو انہوں نے اپنے خلوص، دیانت اور کردار کی بدولت پورا کر دکھایا جبکہ سلطان ٹیپوؒ کے سامنے اپنی سلطنت کی آزادی کو بچانے اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے مستقبل کا سوال تھا جسے وہ حل نہ کر سکا مگر اپنی جان کا نذرانہ دے کر اس نے مسلمانوں کو اپنی آزادی، خودمختاری اور اسلامی تشخص کے تحفظ کی جدوجہد کا راستہ بتا دیا۔ ہمارے سامنے یہ دونوں چیلنج ہیں اور پہلے سے کہیں زیادہ سنگین اور خوفناک شکل میں ہیں۔ اس لیے پاکستان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد کرنے والوں کو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، سلطان نورالدین زنگیؒ اور سلطان ٹیپو شہیدؒ کے کردار، عزم اور حوصلہ و استقامت سے راہ نمائی حاصل کرنا ہوگی اور محض ''روایتی سیاسی عمل'' پر قناعت کرنے کی بجائے ایک ملی و دینی مشن کے طور پر اس کے طریق کار اور ترجیحات کا تعین کرنا ہوگا۔

آخر میں صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت کے حوالہ سے بھی کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ نہ صرف پاکستان کے عوام بلکہ دنیا بھر کی دینی تحریکات اور دینی کارکنوں کی نظریں ان پر لگی ہوئی ہیں اور افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کے جبری خاتمہ نے دنیا بھر کے دینی

کارکنوں کے دلوں پر جو زخم لگائے ہیں، وہ صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی کامیابی کو اپنے زخموں پر مرہم کی طرح محسوس کر رہے ہیں۔ میں اس سلسلہ میں اپنے ذاتی مشاہدہ کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ۱۰/اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات کے موقع پر میں لندن میں تھا۔ انتخابات کے نتائج سامنے آنے پر کم از کم چھ مختلف ملکوں کے مسلم دانش وروں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور مبارک باد دیتے ہوئے اپنے جذبہ اور خلوص کے مطابق صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی متوقع حکومت کو کامیاب بنانے کے لیے بہت سے مشورے دیے۔ انہیں یہ غلط فہمی تھی کہ شاید متحدہ مجلس عمل میں مجھے بھی ایسی حیثیت حاصل ہے کہ میں اس کی قیادت کو پالیسی اور ترجیحات کے معاملہ میں کوئی مشورہ دے سکتا ہوں اور اسی وجہ سے وہ مجھے مفید مشوروں سے نواز رہے تھے جبکہ میں اس بات پر خوش تھا کہ متحدہ مجلس عمل کو صرف پاکستان کے دین دار عوام ہی نہیں بلکہ مختلف ملکوں کے مسلمان دانش ور بھی اپنی جماعت سمجھ رہے ہیں اور اس سے توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ ان سب دوستوں کے مشوروں کا خلاصہ یہ تھا کہ:

☆ متحدہ مجلس عمل کو صوبہ سرحد میں ایک مثالی عوامی اور اسلامی حکومت کا عملی نقشہ پیش کرنا چاہیے۔

☆ عوامی مسائل کے حل اور مشکلات کے خاتمہ کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

☆ سماجی انصاف اور معاشرتی عدل کی فراہمی کو اولیت دینی چاہیے۔

☆ پروٹوکول، پرسٹیج اور وی آئی پی کلچر کے عذاب سے لوگوں کو نجات دلانا چاہیے۔

☆ صوبائی وزراء کو قناعت، سادگی اور قانون کی یکساں عملداری کا اپنی ذاتی زندگی میں نمونہ بننا چاہیے۔

☆ ناانصافی، رشوت، بدعنوانی اور سرخ فیتہ کی لعنت کے خاتمہ کے لیے سنجیدہ اقدامات کرنے چاہییں۔

☆ عام لوگوں میں اپنی مدد آپ کے تحت سماجی کاموں کا شعور بیدار کرنا چاہیے اور ہر لحاظ سے دوسرے صوبوں اور دوسری سیاسی جماعتوں کے وزراء سے متحدہ مجلس عمل کے وزراء کو الگ اور ممتاز نظر آنا چاہیے تاکہ وہ نہ صرف اپنے صوبہ میں عوام کو عدل وانصاف کا صحیح ماحول فراہم

کر سکیں بلکہ ان کا کردار اور حکومتی طرز عمل ملک کے دوسرے صوبوں کے عوام کے لیے بھی باعث کشش ہو اور پورے پاکستان کے عوام عملاً یہ محسوس کریں کہ ان کی فلاح و بہبود اور بہتر مستقبل اسلامی نظام اور دینی قیادت ہی سے وابستہ ہے۔

ان مشوروں کے ساتھ میں اپنی طرف سے سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت کے لیے ایک مشورہ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامائزیشن کا بہت سا کام اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی شکل میں موجود ہے۔ صرف آئین کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لے کر صوبائی اختیارات کی حدود واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کام کے بعد صوبائی اختیارات سے تعلق رکھنے والی اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو چھانٹ لیجیے اور متعلقہ ماہرین کی مشاورت سے ترجیحات طے کر کے صوبائی اسمبلی کے ذریعہ ان کے بارے میں قانون سازی کا آغاز کر دیجیے کہ اس وقت آپ کے بس میں عملاً صرف یہی ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ جب اپنے بس اور اختیار کا کام آپ کر گزریں گے تو اگلی پیش رفت کی راہیں بھی اللہ تعالیٰ ضرور کھول دیں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، فروری ۲۰۰۳ء)

— ۲ —

سرحد حکومت کی کارکردگی

سرحد حکومت کے اصل کام

سرحد اسمبلی نے گزشتہ دنوں اہم نوعیت کی چند قراردادیں پاس کی ہیں جو اگرچہ سفارشی نوعیت کی ہیں، مگر ان سے سرحد اسمبلی میں متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت کے فکری رجحانات کی نشاندہی ہوتی ہے اور نفاذ اسلام کے حوالے سے وفاقی حکومت اور ملک کی دیگر صوبائی حکومتوں کے لیے ان میں راہ نمائی کا سامان بھی موجود ہے۔

ایک قرارداد میں سرحد اسمبلی نے وفاقی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ پنجاب حکومت کو اس امر کی ہدایت کرے کہ خدائی اور نبوت کی جھوٹے دعویداروں سے سختی سے نمٹا جائے اور ان کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی کی جائے۔ اس قرارداد کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ باغبانپورہ کالج لاہور کے ایک لیکچرر پروفیسر مشتاق نے کچھ عرصے سے ایک نئے مذہب کا پرچار شروع کر رکھا ہے جس کی رو سے وہ خود ''رب جی'' (نعوذ باللہ) کہلاتا ہے اور اس کے پیروکار ایک دوسرے کو رسول کہتے ہیں۔ اس شخص نے ملک کی مختلف دینی اور سیاسی شخصیات کو خطوط لکھے ہیں جن میں انہیں یہ نیا مذہب قبول کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ خط سرحد اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر اکرام اللہ شاہد کے نام بھی بھیجا گیا ہے جو انہوں نے اسمبلی میں پیش کر دیا اور صوبائی اسمبلی نے اس پر شدید غصے کا اظہار کرتے ہوئے ایک متفقہ قرارداد کی صورت میں اس نئے مذہب کے بانی کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا ہے۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق پروفیسر مذکور کے خلاف علاقہ کے عوام میں شدید غصہ پایا جاتا ہے، جب کہ جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور کے مہتمم ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی نے چند رفقا سمیت

علاقے میں جا کر خود صورت حال کی تحقیق کی ہے اور اس بات کی تصدیق کی ہے کہ پروفیسر مشتاق اور اس کے چیلے اپنے اس نئے مذہب کا مسلسل پرچار کر رہے ہیں اور لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ ان پر ایمان لا کر ''قید'' سے نجات حاصل کریں اور چرس، افیون، شراب، بھنگ اور مکمل جنسی آزادی سے لطف اندوز ہوں جو ان کے اس نئے مذہب میں بالکل جائز ہیں۔ اخباری اطلاعات کے مطابق ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی نے ایک وفد کے ہمراہ وزیر اعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی سے ملاقات کر کے انہیں صورت حال سے آگاہ کیا ہے اور ان سے اس نئے مذہب پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا ہے۔

سرحد اسمبلی کی دوسری قرارداد جنوبی وزیرستان پر مبینہ امریکی بمباری کے بارے میں ہے اور اسے پاکستان کی خودمختاری کی سنگین خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے وفاقی حکومت سے کہا گیا ہے کہ یہ ملک کی آزادی، سلامتی اور خودمختاری کا مسئلہ ہے، اس پر امریکہ سے شدید احتجاج کیا جائے اور اس کی روک تھام کے لیے ٹھوس حکمت عملی اختیار کی جائے۔ اس کے جواب میں امریکی افواج کے اس حالیہ وضاحتی بیان سے صورت حال کی سنگینی میں اور اضافہ ہو گیا ہے کہ ہم اپنی کارروائی جاری رکھیں گے، ہمیں اس میں یہ آزادی حاصل ہے کہ ہم جس جگہ کو منتخب کریں، وہاں کارروائی کریں اور یہ پاکستان کی حکومت کی مرضی سے ہوگا۔ وضاحتی بیان میں یہ کہا گیا ہے کہ افغانستان سے ملحق پاکستانی صوبہ سرحد، جس میں امریکا مخالف مسلمان جماعتوں کی حکومت ہے، اس نے واقعہ کو زبردستی اچھالا ہے جو چودہ ماہ قبل افغانستان میں طالبان اور القاعدہ کے خلاف امریکی جنگ کے منافی ہے۔

امریکی افواج کی اس وضاحت سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ امریکہ کو پاکستان کی سالمیت، خودمختاری اور آزادی کی کوئی پروا نہیں، اس سلسلہ میں بین الاقوامی قوانین اور اصول وضوابط کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں اور صوبہ سرحد کے عوام کی اکثریت نے امریکی طرز عمل اور اقدامات کے خلاف حالیہ ایکشن میں جس کھلی نفرت کا اظہار کیا ہے، وہ اس سے کوئی سبق حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ نیز اس وضاحتی بیان کے مندرجات کی رو سے اسے اس ساری صورت حال میں پاکستان کی وفاقی حکومت کی حمایت حاصل ہے۔

ایک قرارداد جمعہ کی چھٹی بحال کروانے کے بارے میں ہے جس میں وفاقی حکومت سے کہا گیا ہے کہ ملک میں حسب سابق جمعہ کی چھٹی بحال کرانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ ایک قرارداد میں صوبہ سرحد کی اسمبلی نے وفاقی حکومت سے سفارش کی ہے کہ حالیہ افغان لڑائی میں پاکستان کے جتنے مجاہدین امریکا کے خلاف لڑتے ہوئے گرفتار کیے گئے ہیں، انہیں جیلوں سے آزاد کیا جائے۔

ایک قرارداد میں سرحد اسمبلی نے وفاقی حکومت سے سفارش کی ہے کہ ملک میں سودی نظام کے خاتمے کے لیے اقدامات کیے جائیں جبکہ ایک قرارداد میں حکومت سے کہا گیا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش کے مطابق شہریوں کے رہایشی مکانات، ذاتی گاڑیوں اور ذاتی اسلحہ کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ سرحد اسمبلی نے ایک اور قرارداد میں امریکا میں پاکستانی پاشندوں پر نئے امیگریشن قوانین کے اطلاق اور ان کے ساتھ امریکی حکام کے رویے کی مذمت کی ہے اور وفاقی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں امریکی حکومت کو سرحد اسمبلی کی تشویش سے آگاہ کرے۔

سرحد اسمبلی کی ان مختلف قراردادوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت اپنے اس منشور کو سامنے رکھے ہوئے ہے جس کی بنیاد پر اس نے الیکشن میں کامیابی حاصل کی ہے اور اسے عوامی مینڈیٹ کا بھی پوری طرح احساس ہے جو اسے ۱۰/اکتوبر کے انتخابات میں عوام کی طرف حاصل ہوا ہے، لیکن یہ بات قابل توجہ ہے کہ کیا صرف ان قراردادوں سے مذکورہ مسائل کے حل کی طرف کوئی پیش رفت ممکن ہوگی؟ ہم پہلے یہ عرض کر چکے ہیں کہ ان قراردادوں سے صرف صوبہ سرحد کی حکومت کے ذہنی رجحانات کی نشاندہی ہوتی ہے اور ملکی رائے عامہ کی راہنمائی کا سامان فراہم ہوتا ہے، لیکن صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت کو اصل عملی میدان اور ہے اور عملی طور پر موثر اقدامات کیے بغیر سرحد حکومت اپنے منشور اور عوامی مینڈیٹ کے تقاضے پورے نہیں کر سکے گی۔ ہمارے خیال میں متحدہ مجلس عمل کی قیادت اور سرحد میں اس کی صوبائی حکومت کے اصل کرنے کے کام یہ ہیں:

☆ قومی سطح پر ملکی خودمختاری اور سالمیت کے تقاضوں کو اجاگر کرنے اور مسلسل امریکی مداخلت کا راستہ روکنے کے لیے منظم اور مربوط مہم چلائی جائے اور اسے صرف جماعتی جدوجہد تک

محدود رکھنے کی بجائے قومی مہم بنانے کی کوشش کی جائے۔قوم کا ہر طبقہ موجودہ صورت حال سے ناخوش اوراس کے خاتمے کے لیے کچھ نہ کچھ کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں ہے مگراس کے لیے ضروری ہے کہ تمام طبقات کے ساتھ رابطہ قائم کیا جائے اور جماعتی ترجیحات سے بالاتر ہوکراس مہم کوقومی جدوجہد کی حیثیت دی جائے۔

☆ دستور کی مکمل بحالی اورایل ایف او کے خاتمے کے لیے بھی جدوجہد کومربوط اورمنظّم بنانے کی سخت ضرورت ہے۔حکومت نے ایل ایف اوسمیت دستور کی نئی کتاب شائع کر کے عملاً یہ کہہ دیا ہے کہ وہ ان شخصی ترامیم کو پارلیمنٹ سے منظور کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ اس صورت میں منتخب پارلیمنٹ کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی اور دستور کی بحالی کے اعلانات بھی بے معنی ہوکررہ جاتے ہیں۔یہ قومی مسئلہ ہےاوراس کے لیےقومی سطح پر ہمہ گیر جدوجہدوقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

☆ سرحد کی صوبائی حکومت نفاذ اسلام کے عمل کے حوالہ سے موجودہ دستوری صورت حال کا جائزہ لے اورآئینی ماہرین کے تعاون سے قانون سازی اورنظم ونسق دونوں شعبوں میں اپنے اختیارات کا واضح طور پرتعین کرے تاکہ موجودہ حالات میں یہ بات اس کے علم میں ہوکہ وہ عملاً کیا کچھ کرسکتی ہے۔

☆ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات میں سے صوبائی اختیارات سے تعلق رکھنے والی سفارشات چھانٹی جائیں اورانہیں سرحد اسمبلی کے ذریعے قانونی حیثیت دے کران پر مرحلہ وارعمل درآمد کا آغاز کردیا جائے۔

ہم سرحد اسمبلی کی مذکورہ بالاقراردادوں کا خیر مقدم کرتے ہیں اورانہیں ملی حمیت اورقومی غیرت کے اظہار کی علامت قرار دیتے ہوئے متحدہ مجلس عمل کی قیادت اورصوبہ سرحد کی حکومت کے سربراہ جناب محمد اکرم خان درانی سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ قراردادوں کے ذریعے اپنے جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ اپنے منشور اورعوامی مینڈیٹ کے تقاضے پورے کرنے کے لیے سنجیدہ عملی اقدامات کی طرف بھی توجہ دیں گے۔ (روزنامہ اسلام)

سرحد حکومت اور شریعت بل

سرحد حکومت کی طرف سے صوبائی اسمبلی میں شریعت بل لانے کی خبر میں نے چند روز قبل بیرون ملک سفر کے دوران پڑھی تو اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ ملک میں ایک نئی کشمکش کا آغاز ہونے والا ہے، کیونکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ایک صوبے میں صوبائی اختیارات کے دائرے میں آنے والے قوانین کو اسلامی شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کی باتیں نہ صرف یہ کہ ملک کے اندرونی مقتدر طبقات کو ہضم نہیں ہوں گی بلکہ بیرونی آقاؤں کے لیے بھی یہ قطعی طور پر ناقابل برداشت ہوں گی۔ چنانچہ سرحد اسمبلی نے تو متفقہ طور پر شریعت بل پاس کر دیا، لیکن اس سے وفاق میں جو کھلبلی مچی ہے، اس کا اندازہ پے در پے واقع ہونے والے ان واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔

☆ سرحد کے چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کر دیا گیا ہے کیونکہ موجودہ چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس کے بارے میں تاثر یہ ہے کہ وہ صوبائی حکومت کا ساتھ دے رہے ہیں اور یہ سمجھا جا رہا ہے کہ صوبائی حکومت کو ناکام بنانے کی حکمت عملی میں شاید انہیں پوری طرح استعمال نہیں کیا جا سکے گا۔

☆ صدر جنرل پرویز مشرف نے اس موقع پر وفاقی حکومت کو یہ ہدایت جاری کرنا ضروری خیال کیا ہے کہ روشن خیال اسلامی مملکت کے تصور کو مجروح کرنے والی کوششوں کو ناکام بنایا جائے اور اس کے ساتھ ہی وفاقی شرعی عدالت کے چار نئے ججوں کے تقرر کا اعلان کر دیا گیا ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خاصے ''روشن خیال'' ہیں اور اس طرح وفاقی

شرعی عدالت کے دستوری فورم کو ''روشن خیال اسلام'' کے فروغ کا ذریعہ بنانے کی نئی حکمت عملی کا اندازہ ہوتا ہے۔

☆ صوبہ سرحد کے تقریباً تمام اضلاع کے ناظمین نے استعفیٰ دے دیا ہے اور صوبائی حکومت کے خلاف ایک نیا محاذ جنگ کھول دیا ہے جس میں وفاق کی دلچسپی اور حمایت فطری طور پر ناظمین کے کیمپ کے ساتھ ہوگی۔

☆ وفاقی وزیر اطلاعات شیخ رشید احمد نے جن الفاظ میں سرحد حکومت کو خبردار کیا ہے، وہ سرحد حکومت کے ان اقدامات کے بارے میں وفاق کے عزائم کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سرحد حکومت کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں کہ وہ کس طرف جا رہی ہے، اسی لیے انہیں سمجھایا جا رہا ہے کہ وہ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کریں کہ خطہ میں موجود حالات کے باعث ان کے اقدامات کے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

☆ صوبہ سرحد میں پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ایک صوبائی رہنما نے پشاور میں پریس کانفرنس کر کے اعلان کیا ہے کہ وہ صوبائی حکومت کے خلاف صوبہ بھر میں مظاہروں کا اہتمام کر رہے ہیں اور شریعت بل کو عدالت میں چیلنج کرنے کا پروگرام بنایا جا رہا ہے جس کے لیے انہیں پاکستان مسلم لیگ (ق) کی ہائی کمان کی حمایت حاصل ہے۔

☆ وزیر اعظم اس صورت حال پر اس قدر سیخ پا ہیں کہ انہوں نے جہلم میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے متحدہ مجلس عمل کے رہنماؤں سے اس انداز میں مخاطب ہونے سے گریز نہیں کیا کہ ''مسجدوں کا پیسہ کھانے والے ملک کا کیا حشر کریں گے؟''

☆ دوسری طرف متحدہ مجلس عمل کے رہنما مولانا فضل الرحمٰن نے ضلعی حکومتوں کے نظام پر تنقید کرتے ہوئے صوبہ سرحد کے ضلعی نظما کے استعفوں کا خیر مقدم کیا ہے اور کہا ہے کہ ناظموں کو اپنے استعفوں پر قائم رہنا چاہیے تاکہ صوبائی حکومت اطمینان کے ساتھ کام کر سکے۔ انہوں نے اعلان کیا ہے کہ اگر صوبہ سرحد کی حکومت کے خلاف کوئی قدم اٹھایا گیا تو اس کے خلاف عوامی احتجاج منظم کیا جائے گا۔

☆ صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ اکرم خان درانی نے صوبائی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ شریعت بل پر عمل کیا جائے گا اور جو افسر صوبائی حکومت کی ترجیحات کے مطابق کام نہیں کرے گا، اس کے لیے صوبہ میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ صوبہ کے چیف ایگزیکٹو کی مرضی کے خلاف چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس کو استعمال کرنا آئین کی خلاف ورزی ہے۔

☆ اسی حوالہ سے ایک اور خبر کے مطابق صوبہ سرحد کے چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس کو ان کے عہدوں سے ہٹا کر اوایس ڈی بنا دیا گیا ہے۔

اس معرکہ آرائی کے ساتھ وفاق میں ایل ایف او کے حوالہ سے جاری کشمکش پر ایک نظر ڈال لیں تو صورت حال کا نقشہ قدرے مختلف دکھائی دیتا ہے۔ گزشتہ دنوں متحدہ مجلس عمل کے سیکرٹری جنرل مولانا فضل الرحمٰن نے کوئٹہ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر حکومت ملک میں (۱) قرآن وسنت کو سپریم لا قرار دینے کا اعلان کردے، (۲) اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو قانونی شکل دینے کی طرف پیش رفت کرے، (۳) جمعہ کی چھٹی بحال کر دے (۴) بلاسود بینکاری کے لیے اقدامات کرے اور (۵) تعلیمی اداروں کی نجکاری روک دے تو ایل ایف او کے بارے میں متحدہ مجلس عمل اپنے موقف میں لچک پیدا کر سکتی ہے جس پر پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین کا یہ تبصرہ سامنے آیا کہ وہ متحدہ مجلس عمل کی شرائط ماننے کے لیے تیار ہیں اور ان کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو قانون سازی کی بنیاد بنانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

اس صورت حال میں سرحد کی صوبائی حکومت کے خلاف محاذ آرائی کا بازار گرم کیا جا رہا ہے اور بعض حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ بھی سامنے آ رہا ہے کہ صوبائی حکومت کو برطرف کر کے صوبہ میں گورنر راج نافذ کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ سرحد حکومت نے کون سا ایسا جرم کیا ہے کہ اس کے خلاف یہ سارے عناصر صف آرا ہو گئے ہیں؟ صوبائی اسمبلی نے شریعت بل کے نام سے جو مسودہ قانون منظور کیا ہے، وہ ملک کے دستور اور صوبائی حکومت کے دائرہ اختیار کے اندر رہتے ہوئے کیا ہے۔

اس میں کسی غیر متعلقہ بات کو نہیں چھیڑا گیا اور صرف یہ کہا گیا ہے کہ جو معاملات صوبائی حکومت کے دائرۂ اختیار میں آتے ہیں، ان سے متعلقہ قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالا جائے گا اور ان کی تعبیر وتشریح کے لیے صوبہ کی تمام عدالتیں قرآن وسنت کی پابند ہوں گی۔ یہ بات تو نہ صرف دستور پاکستان کے مطابق ہے بلکہ خود دستور کے تقاضے کی تکمیل ہے کیونکہ دستور میں قوم کے ساتھ یہ واضح اور دوٹوک وعدہ کیا گیا ہے کہ ملک کے تمام قوانین کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالا جائے گا۔ یہ وعدہ دستوری طور پر قوم سے ۱۹۷۳ء میں کیا گیا تھا اور اس کے لیے سات سال کی مدت بھی متعین کی گئی تھی، لیکن تیس سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود وفاق یا ملک کے کسی صوبے نے اپنے اختیارات کے دائرہ میں قوم کے ساتھ کیے گئے اس وعدہ کو پورا کرنے کی طرف توجہ نہیں دی اور اب اگر ایک صوبے نے اس دستوری وعدہ کو پورا کرنے کی طرف پیش رفت کر دی ہے تو وفاق اور اس کے حواری خود شرمندہ ہونے کی بجائے اپنی شرمندگی کو چھپانے کے لیے صوبہ سرحد کی حکومت کے خلاف انتقامی کارروائیوں پر اتر آئے ہیں، بالکل اس عوامی کہاوت کی طرح کہ ناک کٹوں کی ایک بستی میں کوئی ناک والا آ گیا تو سب ناک کٹے اس کے پیچھے پڑ گئے اور اسے ''نکونکو'' کہہ کر بستی سے بھگا دیا۔

اسلامی نظریاتی کونسل بھی ایک دستوری ادارہ ہے جسے دستور پاکستان نے قائم کیا ہے اور اس نے دستور کے تفویض کردہ اختیارات کے تحت ملک کے تمام قوانین کا جائزہ لے کر انہیں اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے جامع سفارشات پیش کر رکھی ہیں۔ انہیں قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کے مطابق قانون سازی کرنا تمام وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی آئینی ذمہ داری ہے۔ سرحد حکومت نے اسی دستوری ذمہ داری کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر سرحد حکومت نے نفاذ شریعت کے لیے کوئی غیر جمہوری اور غیر روایتی طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ عوام کے منتخب نمائندوں نے صوبائی اسمبلی کے فورم پر دستوری اختیارات استعمال کرتے ہوئے روایتی جمہوری طریق کار کے مطابق ایک قانونی بل منظور کیا ہے۔ اس پر جمہوریت اور دستور کا نام لینے والے کسی شخص کو اعتراض کرنے کا آخر کیا حق ہے؟

محترم شیخ رشید احمد نے حالات کی سنگینی اور خطہ کی صورت حال کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔ ان سے گزارش ہے کہ حالات کی یہ سنگینی اور خطہ کی مخدوش صورت حال ہمارے حکمران طبقوں کے اسی طرز عمل کا نتیجہ ہے کہ وہ گزشتہ نصف صدی سے اسی قسم کے ہتھکنڈوں کے ذریعہ اسلام کا راستہ روکے ہوئے ہیں اور جب بھی ملک میں نفاذ اسلام کی کوئی سنجیدہ کوشش سامنے آئی ہے، مقتدر طبقات اسی طرح اس کے خلاف حرکت میں آجاتے ہیں۔ سیدھی بات ہے کہ اگر جمہوری طریق کار سے اور انتخابی راستے سے اسلام کو آگے آنے کا راستہ نہیں دیں گے اور عوام کے ووٹ اور جذبات کا احترام نہیں کریں گے تو متبادل راستوں کو کون بند کر سکتا ہے؟ افغانستان میں طالبان اسی وجہ سے متبادل راستوں سے آگے آئے تھے اور اگر پاکستان میں بھی عوام کو اسلام کے نفاذ کے لیے متبادل راستہ اختیار کرنا پڑا تو اس کی ذمہ داری ان طبقات پر ہوگی جو صرف امریکہ کو خوش کرنے کے لیے جمہوری راستہ سے آنے والے اسلام کی راہ روک رہے ہیں۔

(روزنامہ اسلام ۷ر جون ۲۰۰۳ء)

شریعت بل، حکومتی کیمپ اور محترمہ بینظیر بھٹو

سرحد اسمبلی میں شریعت بل پیش کیے جانے کے ساتھ ہی بلکہ اس سے پہلے ہی اس پر ردعمل کے اظہار کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور اس میں دن بدن شدت آ رہی ہے۔ ایک طرف وہ عملی اقدامات ہیں جو سرحد حکومت کو ناکام بنانے اور نت نئے مسائل میں الجھانے کے لیے کیے جا رہے ہیں اور ان میں صوبائی حکومت کو اعتماد میں لیے بغیر چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس کے تبادلوں کا فیصلہ اور ضلعی ناظموں کی طرف سے استعفوں کا اعلان سرفہرست ہیں اور دوسری طرف وفاقی حکومت کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت کے اس اقدام کے خلاف بیان بازی کا سلسلہ جاری ہے، حتیٰ کہ پیپلز پارٹی کی سربراہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے بھی اس معاملہ میں حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملانا ضروری سمجھا ہے اور افغانستان پر امریکی حملہ کے بعد یہ دوسرا مسئلہ ہے جس پر حکمران کیمپ اور محترمہ بے نظیر بھٹو یک آواز اور ہم آہنگ دکھائی دے رہے ہیں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کو افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمہ کے لیے مسلح امریکی مداخلت پر اعتراض نہیں تھا بلکہ انہیں صرف یہ شکایت تھی کہ یہ کام ان کے ذریعے کیوں نہیں لیا جا رہا اور افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف جہاد کے نتیجے میں ابھرنے والے اسلامی رجحانات کو ختم کرنے کے لیے امریکہ بہادر نے ان کی خدمات پر بھروسہ کرنے کی بجائے جنرل پرویز مشرف کی ٹیم کا انتخاب کیوں کیا ہے؟ اور اب بھی ان کا کہنا ہے کہ صوبہ سرحد کی اسمبلی میں شریعت بل کی منظوری جنرل پرویز مشرف کی پالیسیوں کا نتیجہ ہے، ورنہ اگر وہ ان کی جگہ پاکستان میں برسر اقتدار ہوتیں تو

اس کی نوبت ہی نہ آتی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو نے سرحد اسمبلی کے منظور کردہ بل کو ''طالبان بل'' قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ طالبان طرز کے اسلام کو نافذ کرنے کی طرف پیش رفت ہے، حالانکہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ طالبان طرز حکومت اور صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت کے طرز میں زمین آسمان کا فرق ہے:

☆ طالبان افغانستان میں جہادی کمانڈروں کی باہمی کشمکش اور خانہ جنگی کی وجہ سے بذریعہ قوت افغانستان کے اقتدار پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئے تھے، جبکہ متحدہ مجلس عمل نے انتخابی عمل کے ذریعے عوامی ووٹ حاصل کر کے صوبائی حکومت حاصل کی ہے۔

☆ طالبان کا نظام امارت کا نظام تھا جس میں امیر کے شخصی احکامات ہی قانون کا درجہ رکھتے ہیں، جبکہ سرحد کی صوبائی حکومت نے منتخب اسمبلی میں بل پیش کر کے عوامی نمائندوں کے ذریعے اس کا نفاذ کیا۔

☆ طالبان نے افغانستان کے سابقہ نظام کو مکمل طور پر اکھاڑ پھینکا تھا اور اس کی جگہ ایک نیا نظام نافذ کرنے کی طرف پیش رفت کی تھی، جبکہ سرحد حکومت نے ملک کے دستور اور مروجہ سسٹم کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس کی طرف سے ملنے والے اختیارات اور حدود میں نفاذ شریعت کے اقدامات کیے ہیں۔

☆ طالبان نے اسلام کے نفاذ اور اس کی تعبیر وتشریح کے لیے اپنے امیر اور اس کی مجلس مشاورت کو فائنل اتھارٹی قرار دیا تھا، جبکہ صوبہ سرحد کی حکومت نے اس سلسلہ میں دستور پاکستان کے تحت پہلے سے قائم اداروں، اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں کو بنیاد بنایا ہے اور انہیں اتھارٹی تسلیم کیا ہے۔

☆ طالبان کا نظام ہمہ گیر اور قومی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط تھا، جبکہ سرحد اسمبلی کا منظور کردہ شریعت بل صاف طور پر اعلان کر رہا ہے کہ اس کا تعلق صرف ان معاملات سے ہے جن میں دستور کے تحت صوبائی حکومت کو قانون سازی اور نفاذ قانون کا حق حاصل ہے۔ اس

کے علاوہ باقی معاملات سے اسے کوئی سروکار نہیں ہے۔

اس پس منظر میں اس بات پر تو بحث کی گنجایش موجود ہے کہ نفاذ اسلام کے لیے طالبان کا طرز عمل مفید اور موثر تھا یا متحدہ مجلس عمل کا طریق کار زیادہ فائدہ مند ہے، مگر سرحد اسمبلی کے منظور کردہ بل کو ''طالبان بل'' قرار دینا اور اس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس سے طالبان طرز کے اسلام کے نفاذ کی راہ ہموار ہوگی، سراسر مغالطہ نوازی اور کج فہمی کی بات ہے جس کی محترمہ بے نظیر بھٹو جیسی ذہین و فطین خاتون اور تجربہ کار سیاستدان سے قطعی طور پر توقع نہیں کی جاسکتی اور اس پر اس کے سوا کسی تبصرہ کی گنجایش نہیں ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو ساری صورت حال کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے بھی جان بوجھ کر سرحد اسمبلی کے شریعت بل کو عالمی حالات کے تناظر میں انتہائی خوفناک شکل میں پیش کر کے اعلیٰ ترین قوتوں کو یقین دلانا چاہ رہی ہیں کہ اگر انہیں یعنی محترمہ بے نظیر بھٹو کو اسی طرح نظر انداز کیا جاتا رہے گا تو حالات اسی رخ پر آگے بڑھتے رہیں گے۔

دوسری طرف حکمران کیمپ کی صورت حال یہ ہے کہ سرحد اسمبلی میں شریعت بل کی منظوری پر اس کی بے چینی اور اضطراب قابل دید ہے۔ صدر پرویز مشرف نے اس پر اپنے ردعمل کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ وفاقی حکومت کو چاہیے کہ وہ پاکستان کو ایک روشن خیال اسلامی ریاست بنانے کے تصور کو مجروح کرنے کی کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دے۔ وزیر اعظم میر ظفر اللہ خان جمالی نے جہلم میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہہ کر اپنے غصے کا اظہار کیا ہے کہ مسجدوں کے پیسے کھانے والے ملک کا کیا حشر کریں گے؟ حکمران مسلم لیگ کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین نے فرمایا ہے کہ سرحد اسمبلی میں شریعت بل پیش کرنے کی سرے سے کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ جب اسلامی نظریاتی کونسل قائم ہے اور وفاقی شرعی عدالت موجود ہے تو اس کے بعد نفاذ اسلام کے لیے اور کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، حالانکہ یہ بات چودھری صاحب موصوف کے علم میں یقیناً ہوگی کہ صوبہ سرحد کی اسمبلی نے اسی اسلامی نظریاتی کونسل کے فیصلوں اور سفارشات کو صوبائی اختیارات کی حدود میں نافذ کرنے کی بات ہے جس کا ذکر انہوں نے فرمایا ہے اور جسے وہ خود بھی نفاذ اسلام کی علامت قرار دے رہے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل توجہ ارشادات وفاقی وزیر اطلاعات جناب شیخ رشید احمد کے ہیں جنہوں نے متحدہ مجلس عمل کے خلاف گولہ باری کے محاذ کی کمان سنبھال رکھی ہے اور وہ بھی محترمہ بے نظیر بھٹو ہی کے لہجے میں سرحد کی صوبائی حکومت کے لتے لیے جا رہے ہیں۔ شیخ رشید احمد نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز اسلام کے نعرہ سے کیا تھا، شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ کی سرپرستی میں سیاسی پیش قدمی کی راہ ہموار کی تھی اور راجہ بازار راولپنڈی خصوصاً دارالعلوم تعلیم القرآن میں اسلام کے حق میں شیخ رشید احمد کے پرجوش خطابات کی گونج آج بھی پرانے سیاسی کارکنوں کے کانوں میں سنائی دے رہی ہے، مگر اب وہ وزارت اطلاعات کے منصب پر فائز ہونے کے بعد فرما رہے ہیں کہ اسلام کو اسلام آباد سے دور رکھو۔ ان کا ارشاد ہے کہ وہ اسلام کے لیے وہ متحدہ مجلس عمل کے ساتھ ہیں، لیکن متحدہ مجلس عمل اسلام آباد کے لیے فٹ نہیں ہے، اس لیے اسے اسلام آباد سے دور رہنا چاہیے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اسلام اور اسلام آباد کے درمیان فاصلہ قائم رکھنا چاہتے ہیں، وہی فاصلہ جو محترمہ بے نظیر بھٹو کے نزدیک اسلام اور اسلام آباد کے درمیان قائم رہنا ضروری ہے اور وہی فاصلہ جسے آج کے عالمی حکمرانوں نے نہ صرف اسلام اور اسلام آباد کے درمیان بلکہ دنیا کے ہر مسلمان ملک کے دارالحکومت اور اسلام کے درمیان ضروری قرار دے رکھا ہے اور انہی عالمی حکمرانوں کی خوشنودی کی خاطر عالم اسلام کے اکثر و بیشتر حکمرانوں اور سیاستدانوں نے اسلام کے سیاسی اور حکومتی کردار کی نفی کو اپنا فریضہ قرار دے لیا ہے۔

شیخ رشید احمد نے فرمایا ہے کہ متحدہ مجلس عمل کو عالمی حالات اور خطہ کی صورت حال کی سنگینی کا احساس کرنا چاہیے۔ ان کی خدمت میں مودبانہ گزارش ہے کہ اگر ملک کے مقتدر طبقات اسلام کا راستہ اس طرح روکتے رہیں گے تو حالات کی سنگینی میں کمی کے بجائے اضافہ ہوگا۔ یہ ملک اسلام کی خاطر بنا ہے، ملک کے عوام ایک سے زیادہ بار اسلامی نظام کے بارہ میں فیصلہ دے چکے ہیں۔ متحدہ مجلس عمل نے گزشتہ الیکشن میں نفاذ اسلام کے وعدہ پر ووٹ لیے ہیں اور عوامی مینڈیٹ کا احترام اس کی ذمہ داری ہے۔ دستور پاکستان نے ملک کے تمام قوانین کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی گارنٹی دے رکھی ہے، اسلامی نظریاتی کونسل نے دستور کے تفویض کردہ اختیارات کے تحت مروجہ

قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق بنانے کے لیے سفارشات مرتب کی ہیں اور سرحد اسمبلی نے انہی سفارشات پر صوبائی اختیارات کے دائرے میں عمل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اگر شیخ رشید اور ان کا کیمپ عالمی حالات اور خطہ کی صورت حال یا دوسرے الفاظ میں امریکہ اور بھارت کی خوشنودی کی خاطر مذکورہ بالا تمام حقائق کو کراس کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو یہ فیصلہ انہیں مبارک ہو، لیکن ایک بات انہیں ہر وقت یاد رکھنی چاہیے کہ پاکستان کے عوام کو اسلام سے دست بردار کرانے کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوگی اور اگر جمہوری اور سیاسی عمل کے ذریعے نفاذ اسلام کا راستہ روکنے کی کوششیں اسی طرح جاری رہیں تو اس کے ردعمل میں خطہ کی صورت حال جو رخ اختیار کرے گی، اس کا سامنا کرنا شیخ صاحب محترم اور ان کے کیمپ کے بس کی بات نہیں ہوگی۔

(روزنامہ اوصاف، ۱۱ر جون ۲۰۰۳ء)

سرحد میں شرعی قوانین کے نفاذ میں درپیش مشکلات

صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت نے اسلامی اصلاحات کے عمل کا آغاز کر دیا ہے اور صوبائی وزیر اعلیٰ محمد اکرم خان درانی نے گزشتہ روز صوبائی کابینہ کے طویل اجلاس کے بعد پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بتایا ہے کہ مولانا مفتی غلام الرحمٰن کی سربراہی میں جو ''نفاذ شریعت کونسل'' صوبہ میں نفاذ اسلام کے سلسلے میں سفارشات اور تجاویز مرتب کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی، اس نے اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے اور اس رپورٹ میں روشنی میں سرحد اسمبلی میں شریعت ایکٹ لایا جا رہا ہے جس میں صوبائی دائرۂ اختیار کی حدود میں تمام اسلامی قوانین اور اقدامات کو شامل کیا جائے گا۔ نفاذ شریعت کونسل کی سفارشات کا گزشتہ کئی دنوں سے اخبارات میں تذکرہ ہو رہا ہے اور جناب اکرم خان درانی نے پریس کانفرنس میں اس سلسلہ میں کونسل کی جن تجاویز کا ذکر کیا ہے، ان میں درج ذیل امور بطور خاص قابل ذکر ہیں:

☆ صوبہ میں قائم عدالتیں صوبائی دائرۂ اختیار میں آنے والے قوانین کی تشریح وتعبیر شریعت کے مطابق کرنے کی پابند ہوں گی۔

☆ احتساب کے لیے ادارہ قائم کیا جائے گا جس کے تحت صوبائی وضلعی سطح پر محتسب مقرر ہوں گے۔

☆ صوبہ میں نظام صلوٰۃ قائم ہوگا۔

☆ میٹرک تک تعلیم مفت ہونے کے علاوہ مڈل تک تعلیم لازمی ہوگی۔

☆ خواتین کے لیے علیحدہ یونیورسٹی اور میڈیکل کالج قائم کیا جائے گا۔
☆ میٹرک کی سطح پر آرٹس اور سائنس کے ساتھ اسلامیات (درس نظامی) کا گروپ بھی قائم کیا جائے گا۔
☆ مرکزی حکومت سے ادویات پر ٹیکس ختم کرنے کی سفارش کی جائے گی۔
☆ غیرت کے نام پر قتل، خواتین کو میراث سے محروم رکھنے اور یک بارگی تین طلاقیں قابل تعزیر جرم ہوں گی۔
☆ خواتین کی ماڈلنگ اور فحش وعریاں تصاویر پر مکمل پابندی ہوگی۔
☆ اقلیتوں کے حقوق کا مکمل تحفظ اور ان کو پوری مذہبی آزادی دی جائے گی۔

یہ ان اقدامات کی ایک سرسری فہرست ہے جو صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت نے اسلامائزیشن کے حوالہ سے تجویز کیے ہیں اور چند روز تک اس کی کوئی نہ کوئی عملی شکل سامنے آجائے گی۔ صوبہ سرحد اس سے قبل دو مرتبہ اسی نوعیت کی اصلاحات کے عمل سے گزر چکا ہے۔ ایک بار ۱۸۳۰ء میں، جب خانوادہ ولی اللہی کے مجاہدین نے حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسماعیل شہید کی قیادت میں سکھوں کے ساتھ جہاد کے ذریعے پشاور کی حکومت پر قبضہ کیا تھا اور اس خطے میں نفاذ شریعت کے آغاز کے ساتھ ساتھ اسے جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف جنگ آزادی کا بیس کیمپ بنانے کی کوشش کی تھی، لیکن انہیں اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تھی اور وہ صرف چھ ماہ حکومت کرنے کے بعد ۹ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کر گئے تھے۔ امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید کو نفاذ اسلام کے اقدامات کے حوالہ سے اس خطہ میں بعض طبقات کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ جناب اکرم خان درانی اور ان کے رفقا کی ٹیم کو اپنی ذاتی معلومات کے لیے شہدائے بالاکوٹ کی پشاور پر حکومت اور پھر اس کی ناکامی پر ضروری لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس تجربہ کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے استفادہ کرنا چاہیے، کیونکہ خطہ وہی ہے، عوام کا مزاج اور نفسیات وہی ہیں اور ایجنڈا بھی وہی ہے۔ اس لیے سابقہ تجربہ کا مطالعہ کرنا اور اچھی طرح سے اس کی اسٹڈی کر کے نئے تجربہ کی تیاری کرنا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں

یہ عرض کرنے میں بھی کوئی باک نہیں ہے کہ پشاور کے پڑوس میں کابل اور افغانستان میں ماضی قریب میں طالبان کی اسلامی حکومت کی کامیابی اور ناکامی کے عوامل ونتائج کو جانچنا بھی اس نئے تجربے کا ناگزیر تقاضا ہے۔ یہ درست ہے کہ طالبان حکومت کی ناکامی کے زیادہ تر عوامل خارجی ہیں، لیکن یہ کہہ کر ہم ان داخلی عوامل کی نفی نہیں کرسکتے جن کی وجہ سے خارجی عوامل کو آگے بڑھنے اور منفی کردار ادا کرنے کا موقع مل گیا تھا اور عقل ودانش کا تقاضا ہے کہ امارت اسلامی افغانستان کے المناک سقوط کے کے داخلی اور خارجی، دونوں طرح کے اسباب وعوامل کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور کسی بھی نئے تجربے میں ان سے سبق اور رہنمائی حاصل کی جائے۔

پشاور میں اسلامی اصلاحات کا دوسرا مرحلہ اس وقت آیا تھا جب حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے صوبہ سرحد میں جمعیۃ علمائے اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کے کولیشن سے قائم ہونے والی صوبائی حکومت میں وزیراعلیٰ کا منصب سنبھالا تھا اور شراب پر پابندی کے اعلان کے ساتھ حکومت کا آغاز کیا تھا۔ حضرت مفتی صاحب کو تقریباً بیس ماہ تک حکومت کرنے کا موقع ملا تھا اور اس کے بعد صوبہ بلوچستان میں جمعیت اور نیپ کی کولیشن حکومت کے وزیراعلیٰ سردار عطاء اللہ خان مینگل کی برطرفی پر احتجاج کرتے ہوئے انہوں نے وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس دس ماہ کے دوران اگرچہ مفتی صاحبؒ چند اقدامات ہی کرسکے تھے اور باقی اصلاحات کے لیے تیاریاں جاری تھیں کہ حکومت ختم ہوگئی، لیکن ان چند اقدامات مثلاً شراب پر مکمل پابندی، اردو کو سرکاری زبان قرار دینا، سکولوں میں قرآن کریم کی تعلیم لازمی قرار دینے اور تقاوی قرضوں پر سود کی معافی جیسے اقدامات کے حوالہ سے انہیں بیوروکریسی اور دیگر حلقوں کی طرف سے جن رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا، ان کا جائزہ لینا اور نئے تجربہ کے موقع پر انہیں سامنے رکھنا ضروری ہے، کیونکہ اصل مسئلہ اقدامات واصلاحات کا نہیں بلکہ ان پر عمل درآمد کا ہے اور ہمارے ہاں سول سروس کا جو نظام فرنگی استعمار سے ہمیں ورثہ میں ملا ہے، اس کی موجودگی میں کسی اچھے سے اچھے اقدام کی کامیابی کے امکانات بھی مخدوش ہوجاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں بیوروکریسی سے ہی ایک شہادت پیش کرنا چاہوں گا۔ جن دنوں مولانا سمیع الحق

اور مولانا قاضی عبداللطیف کی طرف سے سینٹ میں پیش کردہ شریعت بل زیر بحث تھا اور پورے ملک میں جدوجہد ہو رہی تھی، گوجرانوالہ ڈویژن کے کمشنر غلام مرتضیٰ پراچہ نے، جو ایک پرانے اور تجربہ کار بیوروکریٹ تھے، مجھ سے ایک ملاقات میں پوچھا کہ یہاں آپ حضرات کیا کر رہے ہیں؟ میں نے بتایا کہ شریعت بل کے بارے میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ یہ بل تسلیم ہوگا اور قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لاتسلیم کیا جائے گا تو ملک میں تمام قوانین کی اسلام کے مطابق تعبیر وتشریح ضروری ہو جائے گی اور بتدریج ملک کا نظام اسلامی ہو جائے گا۔ یہ سن کر پراچہ صاحب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ مولوی صاحب! آپ بڑے بھولے ہیں۔ آپ ملک میں شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ نہیں دیکھ رہے کہ یہ کام آپ کون سی مشینری کے ذریعے کرنا چاہ رہے ہیں؟ ارے بھائی، عمل درآمد تو ہم لوگوں نے کرانا ہے۔ یہاں تو ہم بیٹھے ہیں۔ آپ اگر خود بھی اقتدار میں آجائیں تو آپ کے احکامات کا نفاذ تو ہمارے ذریعہ سے ہونا ہے۔ اگر آپ ہم سے اس سلسلہ میں کوئی توقع رکھتے ہیں تو یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔ پہلے ہماری جگہ اپنا آدمی بٹھانے کی کوئی صورت نکالیں، اس کے بعد اسلام کے نفاذ کی بات کریں۔

یہ بات سوفیصد درست نہ بھی ہو تو سوفیصد غلط بھی نہیں ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انتظامیہ اور عدلیہ کی موجودہ مشینری تعلیم وتربیت کے جن مراحل سے گزر کر آئی ہے، ان کے پیش نظر اگر وہ خود چاہے تو بھی شاید نفاذ اسلام کے عملی اقدامات اس کے لیے آسان نہیں ہوں گے۔ ان گزارشات کا مطلب یہ نہیں کہ ہم صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت کے مجوزہ اور مذکورہ اقدامات سے اختلاف کر رہے ہیں۔ نہیں اور ہرگز نہیں، بلکہ یہ ہماری خواہشات اور جذبات کا آئینہ دار ہیں اور صوبہ سرحد کے عوام کی دیرینہ خواہش کی عکاسی کرتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک اصلاحات کی طرف قدم بڑھانے کے ساتھ ساتھ ان خفیہ اور علانیہ رکاوٹوں کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ نیز اس سے قبل اس سلسلے میں ہونے والے تجربات کی ناکامی کے اسباب کا مطالعہ بھی لازمی ہے کیونکہ ان رکاوٹوں اور اسباب کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں پس پردہ رکھنے کی بجائے بے نقاب کر کے اس سلسلہ میں عوام کو اعتماد میں لینا بھی اسلامائزیشن کی جدوجہد کا

ناگزیر تقاضا ہے۔

ان معروضات کے ساتھ ہم جناب محمد اکرم خان درانی اور ان کے رفقا کو اس اہم پیش رفت پر مبارکباد دیتے ہیں اور ان کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت اس مشن میں انہیں مکمل کامیابی سے نوازیں، راستہ کی رکاوٹیں عبور کرنے کی ہمت عطا فرمائیں اور ان کی اس کاوش کو پورے پاکستان بلکہ دیگر مسلم ممالک کے لیے بھی ایک لائق تقلید نمونہ بنا دیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام ۳۰/مارچ ۲۰۰۳ء)

قومی خودمختاری کی بحالی۔ ہمارا اصل مسئلہ!

''آن لائن'' کی رپورٹ کے مطابق گورنر سرحد سید افتخار حسین شاہ نے سرحد اسمبلی کے منظور کردہ ''حسبہ ایکٹ'' کو آئین سے متصادم قرار دیتے ہوئے واپس کر دیا ہے۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ گورنر کی طرف سے ''حسبہ ایکٹ'' پر سات اعتراضات کیے گئے ہیں جن میں آئین سے تجاوز اور عدالتوں کو نظر انداز کرنے کے دو اعتراض بھی شامل ہیں، جبکہ صوبائی وزارت قانون نے چھ صفحات پر مشتمل جواب میں ان اعتراضات کو غلط فہمی پر مبنی قرار دیا ہے۔ جواب میں کہا گیا ہے کہ ''حسبہ ایکٹ'' ممتاز آئینی اور قانونی ماہرین کی مشاورت سے بنایا گیا ہے اور اس میں جو طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے، اس کی آئین میں گنجایش موجود ہے۔ اس سے قبل خبر آئی تھی کہ گورنر سرحد نے ۷ر جون کو منظور کردہ سرحد اسمبلی کے ''شریعت ایکٹ'' پر دستخط نہیں کیے۔

ہمیں پہلے سے اندازہ تھا کہ سرحد اسمبلی ''شریعت ایکٹ'' اور ''حسبہ ایکٹ'' کے نام سے جو کچھ کرنے جا رہی ہے، اگرچہ اس میں آئینی حدود کی پاسداری کی مکمل ضمانت دی گئی ہے، صوبائی اختیارات کی دستوری حدود میں رہنے کا اعلان کیا گیا ہے، سرحد اسمبلی نے متفقہ طور پر اس کی منظوری دی ہے اور صوبہ سرحد کے عوام نے موجودہ سرحد اسمبلی کو اسی بات کا مینڈیٹ دیا ہے، لیکن اس سب کچھ کے باوجود یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی اور ملک کی اصل حکمران ''اسٹیبلشمنٹ'' کے لیے یہ بات کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہوگی کہ ملک کے کسی حصے میں شرعی قوانین اور احکام کے نفاذ کی طرف اس طرز کی کوئی پیش رفت ہو جس سے موجودہ سسٹم اور نظام کے کسی بھی حصے کے متاثر ہونے

کا کوئی امکان نظر آتا ہو۔ اس لیے گورنر سرحد کے یہ اعتراضات اور اسمبلی کے منظور کردہ ایکٹ پر دستخط کرنے سے ان کا گریز ہمارے لیے قطعاً غیر متوقع نہیں ہے۔

اس سے قبل حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے دور حکومت میں بھی اس قسم کی صورت حال کا سامنا کر چکے ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ داستان میں نے اس سے پہلے قارئین کی خدمت میں کسی موقع پر پیش کی ہے یا نہیں، البتہ موقع کی مناسبت سے اب اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔ یہ ۱۹۷۲ء کی بات ہے، مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش بن چکا تھا۔ باقی ماندہ پاکستان پر جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب مرحوم ملک کے صدر کی حیثیت سے کاروبار حکومت چلا رہے تھے۔ صوبہ سرحد میں نیپ اور جمعیۃ کی کولیشن کو اکثریت حاصل تھی اور مولانا مفتی محمود کو صوبہ کا وزیر اعلیٰ منتخب کیا گیا تھا۔ ارباب سکندر خان خلیل مرحوم صوبہ سرحد کے گورنر تھے اور دونوں درویش صفت سیاستدانوں کا جوڑ صوبائی منظر پر عجیب سی بہار رکھا رہا تھا۔ مفتی صاحب نے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور سب سے پہلا اعلان یہ کیا کہ صوبہ سرحد میں شراب بنانے، بیچنے اور پینے پلانے پر پابندی ہوگی اور یہ قابل دست اندازیٔ پولیس جرم ہوگا۔ مولانا مفتی محمودؒ نے شراب پر مکمل پابندی کے اعلان کے ساتھ صوبہ سرحد میں اپنی حکومتی ذمہ داریوں کا آغاز کیا اور اس کے ساتھ اردو کو سرکاری زبان قرار دینے، تقاوی قرضوں پر سود کی معافی اور اسکولوں میں دینیات کے استاد مقرر کرنے سمیت متعدد دیگر اصلاحات بھی کیں، مگر شراب پر پابندی کا اعلان ملک بھر میں موضوع بحث بن گیا۔ جدید حلقوں میں اسے ''دقیانوسیت'' سے تعبیر کیا گیا، ترقی اور تہذیب کے منافی قرار دیا گیا اور ماضی کی طرف واپس جانے کے طعنے دیے گئے۔ بعض زیادہ منچلوں نے اسے طنز و تشنیع اور تمسخر و استہزا کا نشانہ بھی بنایا اور مختلف محافل میں شراب کی بوتلوں کو ''چھوٹا مفتی'' اور ''بڑا مفتی'' کا نام دے کر اسلام مخالف عناصر نے دل کی بھڑاس نکالنے کا راستہ اختیار کیا، لیکن اس سلسلہ میں سب سے دلچسپ بات وہ خط و کتابت تھی جو وفاق نے اس مسئلہ پر صوبائی حکومت کے ساتھ کی اور جس کی تفصیل حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے خود ایک موقع پر جمعیۃ علمائے اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں ہمیں سنائی۔

مفتی صاحب نے بتایا کہ صوبہ سرحد میں شراب پر پابندی کے اعلان کے بعد وفاق کی طرف

سے صوبائی حکومت کو پہلا خط یہ موصول ہوا کہ شراب پر پابندی کے بعد اس مد سے صوبائی حکومت کو ٹیکس کی جو آمدنی ہوتی تھی، وہ موقوف ہوجائے گی اور صوبائی بجٹ میں اس سے خسارہ ہوگا۔ صوبہ اس خسارہ کو پورا کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرے گا؟ کیونکہ مرکز اس سلسلہ میں صوبے کی کوئی مدد نہیں کرسکے گا۔ صوبائی حکومت نے جواب دیا کہ ہم اپنے اخراجات میں کمی کرکے اس خسارے سے نمٹ لیں گے اور وفاق کو اس سلسلہ میں زحمت نہیں دیں گے۔ اس کے بعد دوسرا خط وفاق کی طرف سے یہ آیا کہ صوبے میں غیر مسلم بھی رہتے ہیں جو شراب کو حرام نہیں سمجھتے، انہیں شراب مہیا کرنے کے لیے صوبائی حکومت کیا اقدامات کررہی ہے؟ اس کا جواب مفتی صاحب کی حکومت نے یہ دیا کہ جو غیر مسلم شراب کو حرام نہیں سمجھتے، ان پر شراب کی پابندی کا اطلاق نہیں ہوگا، لیکن انہیں شراب مہیا کرنا اور اس کا اہتمام کرنا حکومت کی ذمہ داری نہیں ہے، اس لیے ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتے۔ اس کے بعد تیسرا خط آگیا کہ شراب بعض بیماریوں کا علاج ہے، اس لیے بیماروں کے علاج کے لیے ہسپتالوں میں شراب مہیا کرنے کا اہتمام ضروری ہے۔ صوبائی حکومت نے اس کے جواب میں صوبائی ہیلتھ سیکرٹری کی سربراہی میں ممتاز ڈاکٹر صاحبان پر مشتمل میڈیکل بورڈ بنادیا اور اس کے ذمے یہ بات لگائی کہ ایسی بیماری کی نشان دہی کی جائے جو جان لیوا ہو اور شراب کے علاوہ اس کا کوئی متبادل علاج نہ ہو۔ مفتی صاحب کا کہنا تھا کہ اگر میڈیکل بورڈ کسی ایسی بیماری کی نشاندہی کردیتا تو ہم اس کے لیے شرعی اصولوں کی روشنی میں شراب مہیا کرنے کی کوئی صورت ضرور نکالتے، لیکن میڈیکل بورڈ کی رپورٹ یہ تھی کہ ایسی کوئی بیماری دنیا میں نہیں ہے جو جان لیوا ہو اور اس کا شراب کے علاوہ کوئی اور متبادل علاج نہ ہو۔

شراب کے مسئلہ پر وفاق اور صوبے کی یہ ''کاغذی جنگ'' ابھی اس مرحلہ تک پہنچی تھی کہ بھٹو صاحب مرحوم نے بلوچستان میں نیپ اور جمعیت کی مشترکہ حکومت کو، جو سردار عطاء اللہ مینگل کی سربراہی میں کام کررہی تھی، اچانک برطرف کردیا جس پر احتجاج کرتے ہوئے سرحد کے گورنر ارباب سکندر خان خلیل مرحوم اور وزیر اعلیٰ مفتی محمودؒ نے استعفا دے دیا اور اس طرح تقریباً دس ماہ تک کام کرنے کے بعد سرحد اور بلوچستان، دونوں صوبوں میں نیپ اور جمعیۃ کی مشترکہ حکومتیں ختم

ہوگئیں۔

یہ اس دور کی بات ہے جب پاکستان کے معاملات میں بیرونی مداخلت اگرچہ موجود تھی لیکن اس قدر ہمہ گیر اور علانیہ نہیں تھی اور ہمارے حکمران طبقات اپنے ''خفیہ سرپرستوں'' کی ناراضگی سے بچنے کے لیے کسی بھی ایسے اقدام میں روڑے اٹکانا اپنی ذمہ داری سمجھا کرتے تھے جس سے کسی اسلامی قانون پر عملدرآمد کی کوئی صورت دکھائی دیتی ہو۔ اب تو صورت حال ہی مختلف ہے کیونکہ اب امریکہ کی قیادت میں ''ورلڈ اسٹیبلشمنٹ''، کھلم کھلا ہمارے معاملات کو کنٹرول کر رہی ہے اور اس کے اہداف میں سرفہرست یہ بات ہے کہ پاکستان کو ایک عملی اسلامی ریاست بننے سے روکا جائے، اس لیے ان حالات میں ملک کی داخلی اسٹیبلشمنٹ سے یہ توقع رکھنا ہی عبث ہے کہ وہ نفاذ اسلام کی طرف کسی معمولی سی پیش رفت میں تعاون کرے گی یا کم از کم اسے برداشت ہی کر لے گی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم نفاذ شریعت کے اقدامات کے حق میں نہیں ہیں۔ یہ تو ہمارے فرائض میں سے ہے اور جس شخص یا جماعت کو جس سطح پر اور جس درجے میں بھی اس کا کوئی موقع ملتا ہے، اسے ضائع کرنا ہمارے نزدیک شرعی طور پر کوتاہی اور جرم متصور ہوتا ہے، البتہ ایسے کسی اقدام کے نتیجہ خیز ہونے کی توقع رکھنا اور یہ سمجھ لینا کہ مروجہ سسٹم کے ہوتے ہوئے ہم اس ملک میں نفاذ اسلام کی طرف کوئی عملی پیش رفت کر سکیں گے، خود فریبی کی بات ہوگی۔ ہمارا اصل مسئلہ قومی خود مختاری کی بحالی کا ہے اور یہ حق حاصل کرنے کا ہے کہ ہم اپنے فیصلے خود کر سکیں اور ہمیں اپنے ملک کے لیے کوئی نظام پسند کرنے یا قومی زندگی کے طور طریقے طے کرنے کے حوالے سے طاقت کے زور پر ڈکٹیشن نہ دی جائے، کیونکہ جب تک ہم اپنے فیصلے خود کرنے اور اپنے معاملات خود طے کرنے کا حق بحال نہیں کرا لیتے، تب تک پاکستان میں نفاذ اسلام یا نظام میں اصلاح کے کسی بھی عمل کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

(روزنامہ اسلام، ۲۳ جولائی ۲۰۰۳ء)

طالبائزیشن اور امریکنائزیشن!

سرحد اسمبلی نے دو دن کی بحث کے بعد ''حسبہ بل'' چونتیس کے مقابلے میں اڑسٹھ کی اکثریت سے منظور کر لیا ہے، جبکہ وفاقی حکومت نے اسے دستور میں بنیادی حقوق کے بارے میں دی گئی ضمانت کے منافی قرار دیتے ہوئے سپریم کورٹ میں جانے کا اعلان کر دیا ہے۔ اے پی پی کے مطابق وفاقی وزیر قانون جناب وصی ظفر نے کہا ہے کہ حسبہ بل ملک میں انارکی پھیلانے اور جمہوریت کو ناکام بنانے کا ذریعہ بنا ہے جسے موجودہ جمہوری حکومت ہرگز کامیاب نہیں ہونے دے گی۔ اس کے ساتھ ہی اخباری اطلاعات کے مطابق وفاقی حکومت نے اٹارنی جنرل مخدوم علی خان کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ دستور کی دفعہ ۱۸۶ کے مطابق سپریم کورٹ میں اس استفسار کے لیے ریفرنس دائر کرنے کی تیاری کریں کہ کیا سرحد اسمبلی کا منظور کردہ یہ حسبہ بل دستور میں بنیادی حقوق میں دی گئی ضمانت کے منافی تو نہیں ہے؟

حسبہ بل کے حوالے سے بحث ایک عرصہ سے جاری تھی اور اس کے بارے میں حمایت اور مخالفت پر مشتمل تند و تیز بیانات کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اب اس کشمکش نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا ہے اور بحث کا میدان سپریم کورٹ میں لگے گا جہاں دونوں طرف کے وکلا اور دانش ور بنیادی حقوق کی دستوری دفعات اور حسبہ بل کی جزئیات کی چھان بین کریں گے۔ یوں بحث مباحثے کا ایک نیا بازار گرم ہوگا۔ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک سپریم کورٹ نے اسلامائزیشن کے مختلف اقدامات کے حوالے سے جو حتمی فیصلے دیے ہیں، ان کا ریکارڈ سامنے رکھتے ہوئے سرحد اسمبلی کے

منظور کردہ حسبہ بل کے بارے میں بھی یہ توقع کرنا مشکل ہے کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ ماضی کی روایات سے ہٹ کر ہوگا، اس لیے نظر یہی آتا ہے کہ قرارداد مقاصد کی دستوری بالادستی اور سودی قوانین کے خاتمے کی طرح حسبہ بل بھی دستوری آنکھ مچولی کے بعد پاکستان کے ''دستوری عجائب گھر'' کی نذر ہو جائے گا اور کاروبار زندگی حسب سابق اسی طرح معمول کے مطابق چلتا رہے گا جیسے گزشتہ پچپن برس یا اس سے ڈیڑھ دو سو برس پہلے سے چلتا آ رہا ہے۔

کہا جاتا ہے کی صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت اس بل کے ذریعے اپنا ووٹ بینک محفوظ کرنا چاہتی ہے اور وفاقی حکومت پر جوش مخالفت کر کے اپنی ''بیک'' مضبوط کرنے کی فکر میں ہے۔ اس لیے ہمارے بعض دانش ور دوستوں کے نزدیک یہ محض ایک انتخابی شعبدہ بازی ہے اور ان کے خیال میں کسی کو اس کے بارے میں زیادہ فکر مند نہیں ہونا چاہیے، البتہ ہمارے نزدیک یہ بات قابل اطمینان ہے کہ دونوں ٹیموں نے دستوری دائرے میں رہتے ہوئے کھیل کے قواعد وضوابط کو ملحوظ رکھا ہے۔ سرحد حکومت نے اپنی اننگز صوبائی اسمبلی کی پچ پر کھیلی ہے جو اس کا جائز حق تھا اور وفاقی حکومت اپنی اننگز سپریم کورٹ میں کھیلنے جا رہی ہے جو اس کا جائز حق ہے۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا۔

جہاں تک ''اسلامائزیشن'' کا تعلق ہے، اس کے بارے میں اصل صورت حال وہی ہے جو مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع نے بتائی تھی۔ دارالعلوم کے ترجمان ماہنامہ ''البلاغ'' کے مفتی اعظم نمبر کے مطابق جس دور میں حضرت مفتی صاحبؒ حکومت کے قائم کردہ ''تعلیمات اسلامیہ بورڈ'' کے ممبر تھے اور اس بورڈ کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے کام کرے اور سفارشات مرتب کر کے حکومت کو پیش کرے، اس دوران مفتی صاحب مرحوم نے بورڈ کے سربراہ کو، جو غالباً سپریم کورٹ کے جج تھے، کسی مسئلے پر بحث کے موقع پر یہ کہا کہ ''قانون سازی کے کام کو اسلام کے رخ پر آپ نہیں چلنے دیتے اور غلط پر میں نہیں چلنے دوں گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ گاڑی کھڑی رہے گی۔'' چنانچہ گاڑی کھڑی رہی۔ یہ گاڑی اب تک کھڑی ہے۔ اس کے دونوں طرف طاقت ور انجن لگے ہوئے ہیں، دونوں میں سے کوئی انجن کسی وقت سٹارٹ ہو کر گاڑی کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا ہے تو دوسری طرف کا انجن بھی سٹارٹ ہو جاتا ہے اور اپنی طرف زور لگا کر گاڑی

کو جام کر دیتا ہے۔

یہ تنازع دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے علمائے کرام اور جدید درسگاہوں کے تربیت یافتہ قانونی ماہرین اور ارباب سیاست کے درمیان ہے اور اس کشمکش کے دو بنیادی نکتے ہیں جن میں کسی ایک نکتے پر بھی کوئی فریق لچک دکھانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ایک نکتہ اختلاف یہ ہے کہ علمائے کرام کا موقف یہ ہے کہ چونکہ جدید قانون کے ماہرین قرآن وسنت کی تعلیمات سے کما حقہ بہرہ ور نہیں ہیں، اس لیے انہیں قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح میں علمائے کرام کی بات کو حتمی سمجھنا ہوگا۔ دوسری طرف عصری قانون کے ماہرین کا کہنا ہے کہ چونکہ علمائے کرام آج کے مروجہ قانونی سسٹم اور قوانین سے واقفیت نہیں رکھتے، اس لیے ان کی رائے کو حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا آسان ساحل یہ تھا کہ ملک کے تعلیمی نظام میں تبدیلی کر کے ماہرین قانون کی ایسی کھیپ تیار کی جائے جو جدید قانونی نظام اور تقاضوں سے بھی پوری طرح واقف ہو اور قرآن وسنت کے ضروری علوم میں بھی مہارت رکھتی ہو اور جب تک وہ کھیپ تیار ہو کر معاملات سنبھالنے کی پوزیشن میں نہ آجائے، عارضی طور پر ''جوائنٹ سسٹم'' کے طور پر دونوں مل کر اس فریضے کو سرانجام دیں۔ اگر پاکستان بننے کے فوراً بعد ایسا ہو جاتا تو اب تک ہم عارضی دور سے گزر کر ایک نئی تیار شدہ کھیپ کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہو رہے ہوتے، مگر فریقین میں کوئی سے بھی اس مقصد کے لیے آگے بڑھنے کو تیار نہیں ہے۔ نہ عصری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دینی تعلیم کو اس درجہ میں شامل کیا جا رہا ہے کہ قانون کی تعلیم پانے والوں کو قرآن وسنت اور فقہ اسلامی میں مہارت کا درجہ حاصل ہو جائے اور نہ ہی دینی مدارس جدید قانون اور تعلیم کی ضروریات سے اپنے فضلا کو اس سطح پر واقف کرانے کے لیے تیار ہیں کہ وہ جدید قانون اور عصری قانونی سسٹم میں شریک ہونے کی صلاحیت حاصل کر سکیں، اس لیے گاڑی کھڑی ہے اور کشمکش جاری ہے۔

اس تنازع کا دوسرا اختلافی نکتہ یہ ہے کہ علمائے کرام اس بات پر پوری دل جمعی کے ساتھ قائم ہیں کہ نفاذ اسلام کے لیے قانون سازی کا طریق کار فقہی اصولوں کے اسی دائرے میں رہے گا جو چار یا پانچ فقہی مذاہب کی صورت میں گزشتہ تیرہ سو سال سے چلا آ رہا ہے اور قانون سازی کے جدید

اصولوں اور تجربات سے استفادے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، جبکہ عصری قانونی ماہرین کا اصرار ہے کہ اسلامی قوانین کی تشکیل نو کے لیے قانون سازی کے جدید اصولوں کو، جن پر بہر حال مغرب کی چھاپ لگ چکی ہے، بنیاد بنایا جائے اور اسلامی احکام وقوانین کو پورے پرانے ڈھانچے کو قانون سازی اور دستور سازی کے جدید مغربی اصولوں کی روشنی میں از سر نو تشکیل دیا جائے۔

علمائے کرام کے طریق کار اور موقف کو مخالف فریق کی طرف سے ''طالبائزیشن'' کا طعنہ دیا جارہا ہے جب کہ ایک عالم دین نے جواب آں غزل کے طور پر دوسرے فریق کے موقف اور طریق کار کو ''اسلامی تعلیمات کی امریکنائزیشن'' سے تعبیر کیا ہے۔ بہر حال طالبائزیشن اور امریکنائزیشن کی یہ کشمکش ایک نئے دور میں داخل ہوگئی ہے۔ جب دونوں فریق سپریم کورٹ میں آمنے سامنے کھڑے ہوں گے تو بڑی دل چسپ بحثیں سننے میں آئیں گی، نوک جھوک ہوگی، نکتہ رسی ہوگی، سوال وجواب کے مرحلے ہوں گے اور اخبارات کو نئی نئی سرخیاں ملیں گی، البتہ یہ تسلی رہے کہ ہونا ہوانا کچھ بھی نہیں۔

ہمارے محترم جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب اس سلسلے میں اندر کی بات بتا چکے ہیں۔ وہ ''مے لالہ فام'' میں لکھتے ہیں کہ: ''۱۹۵۸ء کے وسط میں مجھے اسکندر مرزا (صدر پاکستان) نے کراچی طلب کیا۔ ان ایام میں معاہدۂ بغداد سے وابستہ ممالک کی ہوائی فوج کے چند سربراہ پاکستان آئے ہوئے تھے۔ شہزادہ علی خان مرحوم اور کیبنٹ لاج بھی کراچی میں موجود تھے۔ سکندر مرزا نے ایک کھانے پر ان سب سے میری ملاقات کرائی۔ دوسرے روز مجھے پھر بلوایا گیا۔ دراصل وہ یہ چاہتے تھے کہ میں کسی نہ کسی صورت میں معاہدۂ بغداد کے سیکرٹریٹ سے منسلک ہوکر بغداد چلا جاؤں۔ میں نے کہا میں سات سال وطن سے باہر رہنے کے بعد واپس آیا ہوں، اس لیے فی الحال میری خواہش پاکستان کو خیر باد کہنے کی نہیں ہے۔ انہوں نے نہایت خلوص سے فرمایا کہ میں تمہیں استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہیں بغداد جانا منظور نہیں تو پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ۱۹۵۶ء کے دستور کے تحت حال ہی میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا گیا ہے، اگر آپ پسند فرمائیں تو مجھے اس کے ساتھ منسلک کر دیں! ممکن ہے میں اس سلسلے

میں کوئی کارآمد خدمت سرانجام دے سکوں۔ یہ سن کر اسکندر مرزا ہنس پڑے اور کہنے لگے ''مگر وہ کمیشن تو محض دکھاوے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے، اس کا مقصد دراصل کچھ بھی نہیں، کیونکہ نہ تو اسے کوئی کام کرنا ہے اور نہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ کوئی کام کرے۔''

پاکستان میں نفاذ اسلام کی کہانی اتنی ہی ہے، اس سے زیادہ اگر کسی کو کوئی توقع ہو تو اس کی اس خوش فہمی کا ہماری موجودہ اسٹبلیشمنٹ اور سسٹم کے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ اس پر مجھے وہ مشہور کہاوت یاد آرہی ہے کہ دو دوست کھانے کے لیے نچلے درجے کے کسی ہوٹل میں گئے۔ میز پر بیٹھے کسی بات پر ان کا جھگڑا ہو گیا اور اس کشمکش میں ان سے ہوٹل کا گلاس ٹوٹ گیا اور دونوں غصے کی حالت میں کھانا کھائے بغیر ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور ہوٹل سے باہر جانے لگے۔ جب وہ بل وصول کرنے والے کاؤنٹر کے قریب سے گزرے تو بیرے نے دور سے آواز لگائی: ''کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا، چار آنے''۔

(روزنامہ پاکستان، ۱۷ر جولائی ۲۰۰۵ء)

اسلام کی تعبیر وتشریح اور قائداعظمؒ

سرحد اسمبلی میں شریعت ایکٹ کی منظوری کے بعد ایک بار پھر ملک بھر میں اسلام کی تعبیر وتشریح کے حوالے سے بحث میں شدت آ گئی ہے اور اس سلسلے میں نئے مضامین اور بیانات منظر عام پر آنا شروع ہو گئے ہیں کہ جن اسلامی احکام اور قوانین کے نفاذ کی بات کی جا رہی ہے، ان کی عملی شکل طے کرنے کے بعد معیار اور طریق کار کیا ہوگا اور ان کی تعبیر وتشریح کا حق کسے حاصل ہوگا؟ چنانچہ اس بارے میں فرزند اقبال جسٹس جاوید اقبال صاحب کا یہ دلچسپ بیان ایک قومی اخبار میں نظر سے گزرا کہ اسلام کی وہی تشریح پاکستان میں قبول کی جائے جو قائداعظم نے کی ہے۔ اگرچہ سرحد اسمبلی نے منظور کردہ شریعت ایکٹ میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے موجودہ سسٹم کو اس قسم کا کوئی خطرہ محسوس ہونے لگے کہ صوبہ سرحد میں یہ سسٹم مذکورہ شریعت ایکٹ کے نفاذ سے کسی بھی درجہ میں متاثر ہوگا اور مروجہ نظام کے وجود یا طریق کار کے لیے کوئی پریشان کن مسئلہ کھڑا ہو جائے گا، لیکن چونکہ اس سے قبل صوبہ سرحد کے پڑوس افغانستان میں شریعت کے نفاذ کے نام پر ایک سسٹم کو ختم کر کے اس کی جگہ دوسرا سسٹم نافذ کر دیا گیا تھا اور طالبان حکومت نے کمیونسٹ دور کے نظام حکومت کی کوئی علامت باقی نہیں رہنے دی تھی، اس لیے ''دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے'' کے مصداق صوبہ سرحد میں شرعی قوانین کے نفاذ کے رسمی اعلان پر بھی ہر طرف ہاہا کار مچ گئی ہے، ورنہ جسے نظام کی تبدیلی یا سسٹم کا انقلاب کہتے ہیں، سرحد اسمبلی کے منظور کردہ شریعت ایکٹ کے نفاذ سے اس کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

سرحد اسمبلی نے صرف اتنا ہی کیا ہے کہ ایک ایکٹ کے ذریعے طے کرلیا ہے کہ صوبہ سرحد میں صوبائی اختیارات کے دائرے میں آنے والے احکام وقوانین کی تشریح قرآن وسنت کے مطابق کی جائے گی اور اسلامی ضوابط کی عمل داری کا اہتمام کیا جائے گا، جبکہ موجودہ دستوری صورت حال پر نظر رکھنے والے حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایل ایف او کی موجودگی میں صوبائی اختیارات کا کوئی متعین دائرہ باقی نہیں رہ گیا، بلکہ جب تک سپریم کورٹ کے جج صاحبان پی سی او کے تحت فرد واحد کی دستوری ترامیم کی عمل داری کے حلف پر قائم ہیں اور ان سے دستور کی وفاداری کا از سر نو حلف نہیں لے لیا جاتا، تب تک دستور کے کسی دائرہ کار اور اس کے دیے ہوئے اختیارات کی عمل داری کی ضمانت اور اس سلسلہ میں عدالتی دادرسی کی عملی شکل موجود نہیں، اس لیے اگر کسی کو یہ خوش فہمی ہے کہ سرحد اسمبلی کے منظور کردہ شریعت ایکٹ سے صوبہ سرحد کے نظام میں کوئی تبدیلی آئے گی اور اس خطے کو نظام شریعت کی برکات سے بہرہ ور ہونے کا کوئی موقع ملے گا تو اسے ''خوش عقیدگی'' اور ''رجائیت'' کے اظہار کے سوا کوئی عنوان نہیں دیا جا سکتا۔ ورنہ ہمارے نزدیک اس ''شریعت ایکٹ'' کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ متحدہ مجلس عمل نے اپنے ووٹروں کو مطمئن کرنے کے لیے یہ بل صوبائی اسمبلی سے منظور کرا دیا ہے کہ ہمارے بس میں جتنی بات تھی، ہم نے کر دی ہے۔ اب آگے اگر اس کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آ رہا یا مروجہ سسٹم شرعی قوانین کو اپنے اندر گھسنے کا موقع نہیں دے رہا تو اس سلسلے میں ہم بے بس ہیں اور اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں، بلکہ مروجہ سسٹم اور اسے چلانے والوں پر عائد ہوتی ہے۔

ہمارے خیال میں متحدہ مجلس عمل نے صرف اس حد تک کیا ہے اور درست کیا ہے۔ یہ اسے ضرور کرنا چاہیے تھا، کیونکہ اس نے عوام سے شرعی قوانین کے نفاذ کے وعدے پر ہی ووٹ لیے ہیں اور اسے اگلے الیکشن میں پھر اپنے ووٹروں کے پاس جانا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنا صوبائی حکومت کے بس میں نہیں تھا، لیکن حیرت ہوتی ہے ان اصحاب دانش پر جو اس ساری صورت حال سے باخبر ہوتے ہوئے بھی آسمان سر پر اٹھائے ہوئے ہیں کہ صوبہ سرحد میں طالبان کا نظام آ گیا ہے اور سرحد حکومت طالبان کے نقش قدم پر چل پڑی ہے۔

یہ طالبان والے نظام کا ہوا بھی خوب ہے جس کا ڈراوا دے کر بہت سے دانش ور اپنی بصیرت

ودانش کا سکہ جمانے میں مصروف ہیں، حالانکہ یہ ہمارے سب دوست کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ طالبان کی حکومت کے طاقت کے زور پر ختم کیے جانے کے بعد وہاں جو حکومت امریکہ کی حمایت اور پشت پناہی سے قائم ہوئی ہے، اس کی سپریم کورٹ نے بھی شرعی حدود، مثلاً رجم کرنا، ہاتھ کاٹنا، کوڑے مارنا اور اس نوعیت کی دیگر اسلامی سزاؤں کو بدستور نافذ رکھا ہوا ہے۔ سپریم کورٹ کے فیصلے سے چند ماہ قبل کابل میں ویڈیو سنٹرز اور کیبل نیٹ کو پولیس نے زبردستی بند کرا دیا تھا اور ابھی حال ہی میں سپریم کورٹ کا ایک اور حکم سامنے آیا ہے جس میں افغانستان کی عورتوں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ گھر سے باہر برقعہ پہن کر نکلا کریں۔ گویا قوانین کے نفاذ اور ان کی تعبیر وتشریح کے حوالے سے ملاعمر کے موقف اور حامد کرزئی کی پالیسیوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہا، لیکن جب یہ اقدامات طالبان حکومت اور ملاعمر کی طرف سے تھے تو پوری دنیا میں طوفان کھڑا ہو گیا تھا کہ تہذیب تباہ ہو گئی ہے، تمدن اور ثقافت کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے اور انسانوں کی آزادی غصب کر لی گئی ہے، لیکن اب وہی اقدامات کرزئی حکومت کی طرف سامنے آ رہے ہیں تو اسلام آباد سے لے کر واشنگٹن تک کے ان اصحاب دانش کو اس طرح سانپ سونگھ گیا ہے جیسے وہ سرے سے اس دنیا میں موجود ہی نہیں رہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ یہی قوانین اسی انداز میں اور اسی تعبیر وتشریح کے ساتھ سعودی عرب میں بھی نافذ ہیں اور گزشتہ پون صدی سے مسلسل نافذ چلے آ رہے ہیں مگر وہاں ان قوانین کا نفاذ کسی کے لیے تکلیف کا باعث نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ صورت حال بھی قابل توجہ ہے کہ صوبہ سرحد کا نفاذ شریعت ایکٹ کسی طرح بھی طالبان کے نظام اور اس طریق کار سے مطابقت نہیں رکھتا۔ طالبان نے قوت کے زور پر اقتدار حاصل کیا تھا، جبکہ صوبہ سرحد کی حکومت عوام کی منتخب کردہ ہے۔ طالبان نے کوئی دستور نافذ کیے بغیر امیر المومنین کے شخصی احکامات کے ذریعے نفاذ اسلام کی طرف پیش رفت کی تھی، جبکہ صوبہ سرحد کی حکومت اور اسمبلی نے پہلے سے نافذ شدہ دستور کے دائرہ میں رہتے ہوئے اور اس کے دیے ہوئے اختیارات کے تحت ''شریعت ایکٹ'' منظور کیا ہے۔ اسی طرح طالبان کا سسٹم پورے ملک کے مروجہ نظام میں مکمل انقلاب کی علامت تھا، جبکہ سرحد اسمبلی کا ''شریعت ایکٹ'' چند جزوی اصلاحات وترامیم کے علاوہ کوئی نتیجہ نہیں دے سکے گا۔ نیز سرحد حکومت نے یہ بل منتخب صوبائی اسمبلی

کے ذریعے نافذ کیا ہے، جبکہ طالبان کے ہاں منتخب اسمبلی کا سرے سے کوئی وجود نہیں تھا۔

اس واضح فرق کے باوجود سرحد حکومت کے نفاذ شریعت کے اقدامات کو طالبان طرز کے اسلام کے نفاذ کی کوشش قرار دے کر جو لوگ پوری دنیا کو اسلام اور پاکستان سے نفرت دلانے کی مہم جاری رکھے ہوئے ہیں، وہ نہ اسلام کے ساتھ کوئی خیر خواہی کر رہے ہیں اور نہ ہی ان کا طرز عمل پاکستان کے بارے میں ہمدردی اور خیر خواہی پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے۔ باقی رہی بات اسلام کی اور اس کی تعبیر وتشریح کی جو بقول ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال صاحب کے قائداعظمؒ نے قرآن وسنت کی، کی تھی تو ہمارے علم میں ایسی کوئی تعبیر وتشریح اس دنیا میں موجود نہیں ہے جسے قائداعظمؒ نے قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح اور شرعی قوانین کی تعبیر کی صورت میں تحریر کیا ہو اور یہ کہا ہو کہ پاکستان میں اسلام کا نفاذ اس تشریح کے مطابق ہوگا۔ اگر جسٹس جاوید اقبال صاحب کے علم میں قائداعظمؒ کا تحریر کردہ ''اسلامی قوانین'' کا کوئی مسودہ ہو تو اسے کسی لائبریری کے خفیہ خانے کی زینت بنانے کی بجائے سامنے لایا جانا چاہیے۔

ہماری معلومات کے مطابق جنوبی ایشیا کے اس خطے میں سرکاری طور پر قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح اور اسلامی قوانین کی تدوین اور تشکیل کے لیے سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے فتاویٰ عالمگیری کے بعد اگر کوئی علمی کام ہوا ہے تو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کا وہ کام ہے جسے متحدہ مجلس عمل کی سرحد حکومت نے نفاذ شریعت کے لیے بنیاد تسلیم کیا ہے۔ اگر محترم جسٹس جاوید اقبال صاحب کو اس پر کوئی اعتراض ہے اور ان کے پاس اسلامی قوانین کا کوئی اس درجے کا متبادل مسودہ موجود ہے تو ہماری مودبانہ درخواست ہے کہ وہ اسے قوم کے سامنے لائیں، ورنہ قائداعظمؒ کے نام کو ملک میں شریعت کے کسی بھی اقدام کو روکنے کے لیے ''بریکر'' کے طور پر استعمال کرنا نہ قائداعظمؒ کے ساتھ انصاف ہے اور نہ ہی جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب جیسی محترم اور دانا وبینا شخصیت کو زیب دیتا ہے۔

(روزنامہ پاکستان، ۲۰ جون ۲۰۰۳ء)

حسبہ بل پر عدالت عظمیٰ کا نیا فیصلہ

بعض اخباری رپورٹوں کے مطابق صوبہ سرحد کے وزیر قانون ملک ظفر اعظم سپریم کورٹ آف پاکستان میں ''حسبہ بل'' کے مقدمہ میں ناکامی پر دل برداشتہ ہو گئے ہیں اور وزارت سے مستعفی ہونے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ حسبہ بل صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت نے عوامی سطح پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام قائم کرنے کے لیے پیش کیا تھا جسے صوبائی اسمبلی نے منظور بھی کر لیا، لیکن وفاقی حکومت کی طرف سے چیلنج کیے جانے کے بعد سپریم کورٹ آف پاکستان نے اس بل کی تین دفعات کو دستور کے منافی قرار دے دیا ہے جس کی وجہ سے یہ بل ایکٹ کی صورت اختیار نہیں کر سکا۔ اس سے قبل بھی حسبہ بل صوبائی اسمبلی سے منظور ہونے کے بعد سپریم کورٹ میں چیلنج ہوا تھا اور عدالت عظمیٰ نے اس پر اعتراضات لگائے تھے جس پر صوبائی وزارت قانون نے اسے از سر نو مرتب کر کے صوبائی اسمبلی میں پیش کیا اور وزیر قانون ملک ظفر اعظم نے کہا کہ اس میں سپریم کورٹ کے اعتراضات اور روایات کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے، لیکن سپریم کورٹ نے ان کے اس موقف کو تسلیم نہیں کیا اور تین دفعات کو دستور کے منافی قرار دے کر واپس کر دیا جس پر ملک ظفر اعظم کی دل برداشتگی اور استعفا کی خبریں آ رہی ہیں۔

ملک صاحب کا تعلق جمعیت علمائے اسلام سے ہے اور جمعیت کے حلقوں کی طرف سے خبر آئی ہے کہ ان کے استعفا پر یکم مارچ کو غور کیا جائے گا۔ جہاں تک ''حسبہ بل'' کا تعلق ہے، اس کا بنیادی مقصد معاشرے میں اسلامی اقدار کا فروغ اور غیر اسلامی رسوم و رواج اور روایات و اقدار کی حوصلہ

شکنی کے لیے ''محتسب اعلیٰ'' کی سربراہی میں ایک نظام قائم کرنا ہے جس سے متعلق افراد کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے اپنے دائرہ کار میں اس بات کی نگرانی کریں کہ قرآن وسنت کے معاشرتی احکام میں سے کس پر عمل ہو رہا ہے اور کس کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہو رہی ہے اور اس سلسلے میں جو کوتاہی نظر آئے، اس کا قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے نوٹس لیں اور ضروری کارروائی کریں۔ ایم ایم اے کی صوبائی حکومت کا موقف یہ ہے کہ یہ اس کی دینی اور دستوری ذمہ داریوں میں سے ہے، جبکہ وفاقی حکومت اور ایم ایم اے کے سیاسی مخالفین کا کہنا ہے کہ یہ روایتی انتظامیہ اور عدلیہ سے ہٹ کر ایک متوازی نظام قائم کرنے کے مترادف ہے جو ایم ایم اے کی حکومت اپنے کارکنوں کو نوازنے کے لیے قائم کر رہی ہے۔

جہاں تک روایتی انتظامی اور عدالتی نظام سے ہٹ کر عوامی سطح پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام کا تعلق ہے تو یہ اسلامی روایات کا حصہ رہا ہے اور خلافت راشدہ سے لے کر بعد کی مسلم خلافتوں کے ادوار تک اس امر کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے کہ کچھ افراد اپنے محلے، شہر اور علاقے پر نظر رکھیں اور شرعی احکام کی خلاف ورزی روکنے کی کوشش کریں جس کے لیے ایک مخصوص حد تک انہیں تعزیری اختیارات بھی حاصل رہے ہیں۔ موجودہ دور میں یہ نظام سعودی عرب میں موجود ہے اور ایک حد تک آزاد کشمیر میں بھی یہ نظام کام کر رہا ہے اور اس کی بنیاد قرآن کریم کے اس ارشاد گرامی پر ہے کہ ''ہم اہل ایمان کو جب زمین میں اقتدار دیتے ہیں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ کا اہتمام کرتے ہیں، لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔'' (سورۃ الحج، آیت نمبر ۴۱) جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیسیوں ارشادات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اہتمام کی بطور خاص تلقین فرمائی ہے۔

باقی رہی بات روایتی قانونی اور عدالتی نظام سے ہٹ کر اس کے لیے کوئی الگ طریق کار اور ڈھانچہ ترتیب دینے کی تو اسے متوازی نظام قرار دینا ہمارے خیال میں درست نہیں ہے، اس لیے کہ اس نے بھی تو دستور اور قانون کے دائرہ میں رہ کر اپنا کام کرنا ہے اور مروجہ نظام میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ بات فرنگی دور سے چلی آ رہی ہے کہ عام عدالتی نظام سے ہٹ کر سوسائٹی میں کچھ

افراد کو ''آنریری مجسٹریٹ'' کا درجہ دے دیا جاتا ہے اور انہیں ایک حد تک اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں۔ ملک کے عمومی عدالتی نظام کی موجودگی میں خصوصی عدالتوں کا قیام بھی اسی روایت کا حصہ ہے اور قانون میں ملک کے مالیاتی نظام کو درست رکھنے کے تمام تر ضابطوں اور قواعد کے ہوتے ہوئے بھی نیب کا الگ نظام قائم کیا گیا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بسا اوقات بعض خرابیاں اس حد تک بڑھ جاتی ہیں کہ مروجہ روایتی نظام کے تحت ان کا راستہ روکنا مشکل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے الگ خصوصی انتظامات ضروری ہو جاتے ہیں، البتہ یہ بات ضروری ہے کہ ملک کے دستور کی حدود کی پابندی کی جائے اور کوئی ایسا راستہ اختیار نہ کیا جائے کہ اس سے دستور کے تقاضوں کی نفی ہوتی ہو، اس لیے عدالت عظمیٰ کا یہ فیصلہ بہر حال واجب عمل اور واجب احترام ہے کہ اگر حسبہ بل یا کسی بھی اور بل میں دستور کی کسی شق کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو اسے درست کر کے دستور کے مطابق بنایا جائے مگر اس پس منظر میں ہم سپریم کورٹ آف پاکستان، بالخصوص چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو ایک پہلو کی طرف توجہ دلانا مناسب خیال کرتے ہیں کہ جہاں دستور کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی کا نوٹس لینا عدالت عظمیٰ کی ذمہ داری ہے، وہاں ہمارے خیال میں کسی دفعہ پر عمل نہ ہونے اور دستور میں کیے گئے کسی وعدہ کے پورا نہ کیے جانے کا نوٹس لینا بھی سپریم کورٹ آف پاکستان کے دائرہ اختیار میں ہے اور عدالت عظمیٰ کو اس سلسلے میں لوگوں کی شکایات اور مشکلات کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

موجودہ دستور ۱۹۷۳ء میں نافذ ہوا تھا اور یہ کسی فرد واحد کا بنایا ہوا دستور نہیں بلکہ ملک کی منتخب دستور ساز اسمبلی نے کئی ماہ کی بحث وتمحیص اور طویل غور وخوض کے بعد اسے منظور کیا تھا۔ اس دستور میں دو باتوں کی ضمانت دی گئی تھی: ایک یہ کہ پارلیمنٹ قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون سازی نہیں کر سکے گی اور دوسری یہ کہ ملک میں جتنے قوانین بھی موجود ہیں، انہیں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی روشنی میں قانون سازی کے باضابطہ عمل کے ذریعے قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالا جائے گا۔ اس کے لیے دستور کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا جس نے سالہا سال کی محنت کے بعد ملک کے تمام قوانین کے بارے میں ایک جامع رپورٹ وزارت قانون

کے حوالے کی جو وزارت قانون کے فریزر میں منجمد پڑی ہے، جبکہ ملک کا عام شہری سوالیہ نشان بنا ہوا ہے کہ پاکستان کا قیام اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور قرآن وسنت کی عملداری کے اہتمام کے لیے عمل میں آیا تھا، اس سلسلے میں قائداعظم محمد علی جناح کے واضح ارشادات اور وعدوں کو کم وبیش ۵۵ برس کا عرصہ گزر رہا ہے اور دستور پاکستان نے ۱۹۷۳ء میں اس بات کی ضمانت دی تھی کہ ملک کے تمام قوانین کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالا جائے گا اور آئندہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی، اس دستوری ضمانت کو بھی ۳۴ برس گزر گئے ہیں مگر حضور! ملک میں نفاذ اسلام کی دلی دور نظر آتی ہے اور عام شہریوں کی مایوسیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور یہ منظر ان کی پریشانیوں اور مایوسیوں میں مزید شدت پیدا کر رہا ہے کہ قرارداد مقاصد کی دستور میں بالادست حیثیت تسلیم نہ کرنے پر عدالت عظمیٰ کا فیصلہ موجود ہے، سود کے قوانین کے خاتمہ کو روکنے کے لیے بھی عدالت عظمیٰ کا فیصلہ سامنے ہے اور اب حسبہ بل کو دوبارہ اعتراضات کے ساتھ واپس کرنے کا فیصلہ بھی آ گیا ہے۔ ہم ان سب فیصلوں کا احترام کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہماری یہ بھی خواہش ہے کہ اگر اسلامی نظام کے نفاذ کے بارے میں دستوری ضمانت کی مسلسل خلاف ورزی کا نوٹس لیتے ہوئے بھی ہماری عدالت عظمیٰ کوئی ٹھوس فیصلہ صادر فرما دے تو اس سے توازن قائم ہو جائے گا اور قیام پاکستان کے نظریاتی ہدف کی طرف پیش رفت کی راہ بھی ہموار ہو جائے گی۔

(روزنامہ اسلام، ۲۸ فروری ۲۰۰۷ء)

رؤیت ہلال پر سرحد اسمبلی کی متفقہ قرارداد

سرحد اسمبلی کی اس متفقہ قرارداد نے رویت ہلال کے مسئلے پر ایک بار پھر ہلچل پیدا کر دی ہے کہ مرکزی رویت ہلال کو توڑ دیا جائے اور رمضان المبارک اور عیدین وغیرہ کے نظام کو سعودی عرب کے ساتھ منسلک کر کے جس روز سعودیہ میں چاند کا اعلان ہو، اس کے مطابق روزہ اور عید کا پاکستان میں بھی اعلان کر دیا جائے۔ گزشتہ سال رمضان المبارک اور عید الفطر کے چاند کے حوالے سے صوبہ سرحد اور باقی ملک میں جو بدمزگی پیدا ہوگئی تھی، اس کے پس منظر میں سرحد اسمبلی کی یہ متفقہ قرارداد خصوصی اہمیت کی حامل ہے جس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر بحث کا سلسلہ جاری ہے۔ سرحد اسمبلی میں یہ متفقہ قرارداد عوامی نیشنل پارٹی کی طرف سے پیش کی گئی جسے متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے حکومتی پارٹی مجلس عمل کی تائید بھی حاصل ہے اور متحدہ مجلس عمل میں چونکہ ملک کے تمام مذہبی مکاتب فکر کے لوگ موجود ہیں، اس لیے اسے صرف سیاسی قرارداد کا درجہ حاصل نہیں رہا، بلکہ مختلف مکاتب فکر کے کردہ علمائے کرام کی رضامندی کی جھلک بھی اس میں نمایاں طور پر دکھائی دے رہی ہے۔

ہمارے ہاں کچھ عرصہ قبل تک رمضان المبارک اور عیدین کے چاند کا مسئلہ خاصی پریشانی کا باعث رہا ہے۔ کوئی مرکزی نظام نہ ہونے کی وجہ سے ملک کے مختلف حصوں میں چاند کے الگ الگ دیکھنے کا اہتمام ہوتا تھا جس کے ساتھ مسلکی اختلافات کا پس منظر بھی شامل ہو جاتا تھا۔ بسا اوقات ایک ہی شہر میں دو دو دن عید ہو جایا کرتی تھی۔ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کی تشکیل کے بعد اس صورت

حال میں خاصا فرق آیا اور اگرچہ صوبہ سرحد کے بعض علاقوں میں پھر بھی الگ عید ہو جاتی تھی، مگر عام طور پر ملک بھر میں رمضان المبارک اور عیدین کا نظام مربوط ہو گیا تھا اور ملک کی اکثریت ایک روز عید منانے لگی تھی۔ اس میں رخنہ گزشتہ سال پیدا ہوا جب صوبہ سرحد کی رویت ہلال کمیٹی نے رمضان المبارک کے چاند کے سلسلے میں مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا اور اس سے صوبہ سرحد کے ایک بڑے حصے میں رمضان اور عید کا نظام باقی ملک سے الگ ہو گیا۔

مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا موقف یہ تھا کہ چونکہ وہ حکومت کی طرف سے مجاز اتھارٹی ہے اور اس نے رویت ہلال کی کوئی تسلی بخش شہادت نہ ملنے کی وجہ سے ۲۹ شعبان کی شام کو چاند نظر نہ آنے اور شعبان کے ۳۰ دن مکمل کرنے کا اعلان کر دیا تھا، اس لیے پورے ملک کو اس فیصلے کی پابندی کرنی چاہیے تھی، جبکہ سرحد کی صوبائی حکومت اور رویت ہلال کمیٹی کا یہ کہنا تھا کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی نے چاند نہ ہونے کے فیصلے میں جلد بازی کی تھی اور فیصلے کے اعلان کے بعد موصول ہونے والی شہادتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے اسے شرعی اصولوں کے مطابق شہادتوں کی بنیاد پر رمضان المبارک کے شروع ہو جانے کا اعلان کرنا پڑا۔ یہی صورت حال عید الفطر پر پیش آئی اور دو متضاد اعلانات کی وجہ سے عام لوگوں کے لیے پریشانی کی صورت حال پیدا ہو گئی۔

سرحد اسمبلی نے اس کا حل یہ نکالا ہے کہ سرے سے پاکستان میں چاند دیکھنے کا اہتمام ترک کر کے سعودی عرب کے اعلان کے ساتھ روزے اور عیدین کو منسلک کر دیا جائے تاکہ نہ صرف ملک بھر میں ایک ہی دن روزہ اور عید ہو، بلکہ عید اور روزہ کے حوالے سے عرب ممالک کے ساتھ اتحاد اور یک جہتی کی فضا قائم ہو جائے۔ ہم اس سے قبل کسی موقع پر عرض کر چکے ہیں کہ سرحد کے بعض علاقوں میں باقی ملک سے ایک دن پہلے عید اور روزہ رکھنے کی وجہ رویت ہلال سے زیادہ افغانستان کے ساتھ ہم آہنگی کا جذبہ ہے اور افغانستان میں چاند دیکھنے کا سرے سے اہتمام نہیں ہوتا بلکہ وہ سعودی عرب کے اعلان پر روزہ اور عید کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا موقف یہ ہے کہ ہم چونکہ حنفی ہیں اور احناف کا مذہب یہ ہے کہ چاند کے مطالع مختلف ہونے کا شرعاً اعتبار نہیں ہے، اس لیے دنیا کے کسی بھی حصے میں چاند نظر آنے کا شرعی ثبوت ہو جائے تو ہم روزہ اور عید کرنے کے پابند ہیں، جبکہ حرمین

شریفین ساری دنیائے اسلام کی عقیدت واحترام کا مرکز ہیں، اس لیے وہاں روزہ اور عید کا اعلان ہو جانے کے بعد دنیا میں کہیں اور چاند دیکھنے کی ضرورت نہیں اور حرمین شریفین کے ساتھ ساری دنیائے اسلام کو روزہ اور عید کا ایک ہی روز اہتمام کرنا چاہیے۔

جہاں تک اس حقیقت کا تعلق ہے کہ چاند کے طلوع ہونے میں سائنسی طور پر دنیا کے مختلف حصوں میں وقت کا فرق موجود ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک علاقے میں ایک روز چاند نظر آتا ہے اور اس سے دور دوسرے علاقے میں دوسرے روز پہلی رات کا چاند دکھائی دیتا ہے تو یہ بات بطور ایک واقعہ کے درست ہے۔ چاند کی گردش کے حوالے سے ایسا ہونا ممکن ہے بلکہ اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے لیکن کیا شرعاً اس کا اعتبار ضروری ہے اور کیا ایسا کرنا درست نہیں ہے کہ ایک جگہ چاند نظر آ جائے تو باقی دنیا کے لوگ اسی کا اعتبار کرتے ہوئے ایک ہی روز روزہ اور عید کا اہتمام کر لیں؟ اسے فقہی اصطلاح میں اختلاف مطالع کا اعتبار کرنے یا نہ کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں فقہائے امت کے دو گروہ ہیں۔ حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے فتاویٰ محمودیہ میں اور حضرت مولانا زوار حسین شاہ آف کراچی نے ''عمدۃ الفقہ'' میں اس کی جو تفصیل بیان کی ہے، اس کے مطابق حنفی، حنبلی اور مالکی مذاہب کے ائمہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں کرتے اور ان کا یہ ارشاد ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں چاند نظر آنے کا ثبوت ہو جائے تو باقی دنیا کے لیے اس کی پابندی ضروری ہو جاتی ہے، البتہ شافعی فقہ کے ائمہ اور احناف میں سے امام زیلعی اور سید انور شاہ کشمیری اختلاف مطالع کا اعتبار کرتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ جہاں چاند دیکھنے میں ایک دن کا فرق پڑ جائے، وہاں مطالع کا اختلاف معتبر ہے اور ایک جگہ چاند نظر آنے سے دوسری جگہ کے لوگوں پر روزہ اور عید لازم نہیں ہوتے۔

ہمارے ہاں پاکستان میں اگرچہ عمل اب تک دوسرے قول پر ہو رہا ہے لیکن اہل سنت کے تینوں مکاتب فکر یعنی بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث کے اکابر علمائے کرام نے صراحت کی ہے کہ ان کے نزدیک مطالع کا اختلاف شرعاً معتبر نہیں ہے اور دنیا میں کسی ایک جگہ بھی چاند کا شرعی ثبوت مل جانے کی صورت میں باقی ساری دنیا کے مسلمان اس کے پابند ہو جاتے ہیں، چنانچہ بریلوی فکر کے ممتاز مفتی حضرت مولانا امجد علی اعظمی ''بہار شریعت'' میں لکھتے ہیں: ''ایک جگہ چاند ہو تو وہ صرف

وہیں کے لیے نہیں، بلکہ تمام جہان کے لیے ہے، مگر دوسری جگہ اس کا حکم اس وقت ہے کہ ان کے نزدیک اس کی تاریخ میں چاند ہونا شرعاً ثابت ہو جائے۔'' دیوبندی مکتب فکر کے ایک بہت بڑے مفتی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ نے ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' میں صراحت کی ہے کہ مطالع کا اختلاف عملاً موجود ہے لیکن احناف کے نزدیک شرعاً اس کا اعتبار نہیں ہے اور اگر مغرب میں چاند نظر آجانے کا ثبوت شرعی ہو جائے تو اہل مشرق اس کے مطابق روزہ رکھنے اور عید کرنے کے پابند ہیں۔ اہل حدیث مکتب فکر کے ہاں قاضی شوکانیؒ کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں ہے اور ''فتاویٰ محمودیہ'' میں مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے قاضی شوکانی کی ایک طویل عبارت نقل کی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ مطالع کے اختلاف کا شرعاً اعتبار نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جمہور فقہائے احناف کے ساتھ ساتھ حنبلی اور مالکی فقہ کے ائمہ کرام کے درمیان اس مسئلے پر کوئی اختلاف نہیں، اہل حدیث مکتب فکر کے قاضی شوکانی بھی اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کے مختلف حصوں میں پہلی رات کا چاند نظر آنے کے اوقات میں فرق موجود ہونے کے باوجود مطالع کے اس اختلاف کا شرعاً اعتبار کرنا ضروری نہیں ہے اور دنیا کے کسی بھی حصے میں چاند نظر آنے کی صورت میں باقی دنیا کے مسلمان بھی اسی روز عید اور روزہ کا اہتمام کر سکتے ہیں، اس لیے ان بزرگوں کی بات مان کر نہ صرف ملک بھر میں ایک ہی روز ے اور عید کا اہتمام ممکن ہے، بلکہ عرب ممالک کے ساتھ عید اور روزہ میں ہم آہنگی بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک سرحد اسمبلی کی یہ متفقہ قرارداد ملک بھر کے دینی حلقوں اور ارباب حل وعقد کی سنجیدہ توجہ کی مستحق ہے۔ پاکستان کے عوام کی ایک مدت سے خواہش ہے کہ وہ سب ایک ہی دن عید منائیں اور اکٹھے روزہ رکھیں۔ ان کی یہ خواہش ناجائز نہیں ہے۔ اسے پورا کرنے میں شرعاً بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور فقہائے امت کی بڑی تعداد ان کے اس حق کی حمایت کر رہی ہے تو پاکستان کے تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علمائے کرام کو بھی اس پر غور کرنا چاہیے۔ ان کے مل بیٹھ کر نیا اجتہادی فیصلہ کرنے سے عوام کو یہ خوشی مل سکتی ہے تو اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔

(روزنامہ پاکستان، ۱۵/اکتوبر ۲۰۰۴ء)

رؤیت ہلال کا مسئلہ

رویت ہلال کا مسئلہ اس بار پھر تنازع کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے اور اس کی بازگشت سپریم کورٹ کے ایوانوں میں بھی سنائی دینے لگی ہے۔ ۲۳ ستمبر (۲۹ شعبان) کو مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین مولانا مفتی منیب الرحمٰن نے اعلان کیا کہ ملک کے کسی بھی حصے سے چاند دیکھے جانے کی شہادت موصول نہیں ہوئی، اس لیے مرکزی رویت ہلال کمیٹی نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ یکم رمضان المبارک ۲۵ ستمبر کو پیر کے روز ہوگی، جب کہ صوبہ سرحد کے وزیر مذہبی امور مولانا امان اللہ حقانی کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ پشاور میں علما کے سامنے چاند دیکھنے جانے کی شہادتیں پیش کی گئی ہیں جن کی بنیاد پر انہوں نے ۲۴ ستمبر اتوار کو یکم رمضان المبارک قرار دینے کا اعلان کیا اور اسی روز پہلا روزہ رکھا، چنانچہ ان دو اعلانات کے حوالے سے صورت حال یہ ہے کہ ملک کے بیشتر حصوں میں رمضان المبارک کا آغاز پیر سے ہوا، مگر صوبہ سرحد کے بعض حصوں میں اس سے ایک دن قبل اتوار سے رمضان المبارک شروع ہو گیا تھا۔ اب جوں جوں عیدالفطر نزدیک آ رہی ہے، یہ مسئلہ دوبارہ بحث ومباحثے کا موضوع بن رہا ہے اور صوبہ سرحد سے بھی اس کے بارے میں دو مختلف ردعمل سامنے آ چکے ہیں۔ مردان کے ایک خطیب مولانا محمد خان صاحب نے سپریم کورٹ آف پاکستان میں درخواست دائر کی ہے کہ چونکہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی ایک آئینی ادارہ ہے، اس لیے عدالت عظمیٰ اس کے فیصلوں پر عمل درآمد کو لازمی قرار دے اور اس کے بغیر کسی ادارے کی طرف سے رویت ہلال کے اعلان کی حوصلہ شکنی کی جائے، مگر سپریم کورٹ آف پاکستان کے پشاور کے بنچ نے جو جسٹس

سردار محمد رضا خان اور جسٹس ناصر الملک پر مشتمل ہے، یہ کہہ کر اس درخواست کو نامنظور کر دیا ہے کہ عوام کی مرضی ہے کہ وہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے اعلان پر عمل کریں یا رویت ہلال کے سلسلے میں کسی پرائیویٹ کمیٹی کے اعلان کو قبول کریں، اس لیے اس سلسلے میں کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔

دوسری طرف صوبہ سرحد کے قدیمی دارالافتا نجم المدارس کلاچی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ روزے، اعتکاف اور عید کے سلسلے میں مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا اعلان ہی معتبر ہے اور چونکہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی تمام مسالک کے جید علمائے کرام پر مشتمل ہے، اس لیے اس سلسلے میں اسی کے اعلان کو قبول کیا جانا چاہیے اور سب کو اسی پر عمل کرنا چاہیے۔ پشاور اور بعض دیگر علاقوں میں اس سے قبل بھی باقی ممالک سے ایک روز قبل روزہ رکھنے اور ایک روز قبل عید کرنے کی روایت چلی آ رہی ہے اور ایسا کئی بار ہو چکا ہے، لیکن اس بار صوبہ سرحد کی حکومت کے اس سلسلے میں خود فریق بننے، سپریم کورٹ میں اس مسئلے کے اٹھائے جانے اور ایک اہم دارالافتا کی طرف سے اس مسئلے پر واضح اظہار رائے کے بعد اس بحث نے نئی صورت اختیار کر لی ہے اور بہت سے سوالات کھڑے کر دیے ہیں جن پر اہل علم کو توجہ دینی چاہیے اور قوم کی راہنمائی کرنی چاہیے۔ ان میں سے ایک دو سوالات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

جہاں تک مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا تعلق ہے، اس کا پس منظر یہ ہے کہ صدر محمد ایوب خان کے دور تک صورت حال یہ تھی کہ اگرچہ سرکاری طور پر چاند نظر آنے یا نہ آنے کا اعلان کیا جاتا تھا، لیکن چونکہ اس کا نظم صرف سرکاری ہوتا تھا، اس لیے عام طور پر اس کا اعتبار نہیں کیا جاتا تھا اور ہر علاقے میں علمائے کرام اپنے طور پر چاند دیکھنے کا اہتمام کر کے اس کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ اس صورت میں اکثر ایسے ہو جاتا تھا کہ ایک شہر میں عید ہو رہی ہے، مگر اس سے تھوڑے فاصلے پر دوسرے شہر میں عید نہیں ہے۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک مسلک کے لوگ روزے رکھے ہوئے ہیں مگر دوسرے مسلک کے لوگوں کی عید ہے۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک شہر کے کچھ لوگ عید منا رہے ہیں اور اسی شہر کے باقی لوگوں کا روزہ ہے، بلکہ ایک بار گوجرانوالہ میں ایسا بھی ہوا ہے کہ خود ہمارے دیوبندی مسلک کے بعض علمائے کرام نے عید کی اور ہمارے مسلک کے دوسرے علما عوام کو روزہ رکھوائے

ہوئے تھے۔ یہ صورت حال پریشان کن ہوگئی تھی اور ہر طرف افراتفری کی کیفیت ہو جایا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی روزے یا عید کے سرکاری اعلانات سے اختلاف کی پاداش میں بعض علمائے کرام کے خلاف کارروائی بھی ہوتی تھی اور بدمزگی کی ایک اور شکل پیدا ہو جایا کرتی تھی، چنانچہ ایک سال عید کے سرکاری اعلانات سے اختلاف کی وجہ سے چار بڑے بڑے علمائے کرام (۱) مولانا غلام غوث ہزاروی، (۲) مولانا احتشام الحق تھانوی، (۳) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور (۴) مولانا مفتی محمد حسین نعیمی گرفتار ہوئے اور کم وبیش ایک ماہ نظر بند رہے۔

اس دور میں روزے یا عید کا سرکاری اعلان تو متنازعہ سمجھا ہی جاتا تھا، مگر آپس میں بھی ایک دوسرے کے اعلانات پر اعتماد نہیں کیا جاتا تھا اور ہر شہر اور ہر مسلک کے علمائے کرام چاند دیکھے جانے کے بارے میں خود اپنی تسلی ضروری تصور کرتے تھے جس سے روزے یا عید کے حوالے سے ملک بھر میں خلفشار کی کیفیت پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ اس پس منظر میں کچھ اصحاب فکر نے دونوں وجوہ کو سامنے رکھتے ہوئے مسئلے کا یہ حل پیش کیا کہ روزے یا عید کا اعلان تو سرکاری طور پر ہی ہونا چاہیے تاکہ باہمی خلفشار سے بچا جا سکے، لیکن یہ اعلان سرکاری اہل کاروں کی طرف سے نہ ہو، بلکہ اس کے لیے تمام مکاتب فکر کے جید علمائے کرام کی ایک مشترکہ کمیٹی قائم کر دی جائے جو چاند کے دیکھے یا نہ دیکھے جانے کا شرعی اصولوں کے مطابق فیصلہ کرے اور اس کا اعلان بھی وہی کرے، لیکن اس کے اعلان کو سرکاری اعلان کی حیثیت حاصل ہو تاکہ اس پر ملک بھر میں یکساں طور پر عمل درآمد ہو سکے۔

مجھے یاد ہے کہ مسئلے کے اس حل کو عملی صورت میں لانے کے لیے حضرت مولانا مفتی محمودؒ سب سے زیادہ فکر مند تھے۔ انھی کی کوششوں سے مختلف مکاتب کے سرکردہ علمائے کرام پر مشتمل مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا سرکاری طور پر قیام عمل میں لایا گیا تھا اور اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ صورت حال پیدا ہوگئی تھی کہ پشاور، مردان اور بعض دیگر علاقوں میں اگرچہ اس سے ہٹ کر فیصلہ کیا جاتا تھا اور اس پر عمل بھی ہوتا تھا، لیکن باقی پورے ملک میں مرکزی رویت ہلال کمیٹی پر اعتماد کرتے ہوئے اس کے مطابق روزے اور عید کا اہتمام متفقہ طور پر ہونے لگ گیا تھا۔ اس سے قبل ہمارے ہاں پشاور کی مسجد قاسم علی خان کی طرح گوجرانوالہ میں مرکزی جامع مسجد اس سلسلے میں سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی

اور روزے یا عید کا چاند دیکھنے اور اس سلسلے میں شہادتیں لے کر فیصلہ کرنے کے لیے علمائے کرام استاذ العلما حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ کے پاس جمع ہو جایا کرتے تھے۔ بسا اوقات ساری ساری رات بحث ومباحثے میں گزر جایا کرتی تھی اور فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا، لیکن مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے قیام کے بعد یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔

میں نے ایک سال ایسے ہی موقع پر حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ سے عرض کیا کہ کیا حسب سابق علمائے کرام سے رابطے کیے جائیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں، اب ہم مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے فیصلے پر ہی عمل کریں گے، چنانچہ اس کے بعد ایسا ہو رہا ہے کہ الگ طور پر چاند دیکھنے یا اس کے بارے میں فیصلے کرنے کی قدیمی روایت ترک ہو گئی۔ مرکزی رویت ہلال کمیٹی جو بھی فیصلہ کرے، ہم اس پر عمل کرتے ہیں اور کم وبیش پورے ملک میں مذکورہ بالا استثنا کے ساتھ اب صورت حال یہی ہے۔

میرے خیال میں اس مسئلے میں خلفشار کی نئی صورت صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت کے اس سلسلے میں فریق بننے سے رونما ہوئی ہے، ورنہ پشاور، مردان اور دیگر بعض قبائلی علاقوں میں ہر سال الگ سے روزہ اور عید کا فیصلہ کیے جانے کے باوجود ملک بھر میں روزہ اور عید کے سلسلے میں اتفاق کی صورت پیدا ہو گئی تھی اور بعض علاقوں کے اختلافات کو ان کا ''تفرد'' سمجھ کر گوارا کر لیا گیا تھا، لیکن متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت نے چاند کے مسئلے پر فریق بن کر اس ''تفرد'' کو باقاعدہ ''تنازع'' کی شکل دے دی ہے۔

یہاں دو سوالات غور طلب ہیں جن کی طرف اہل علم کو توجہ دلا رہا ہوں۔ ایک یہ کہ خود علمائے کرام اور دینی جماعتوں کی مرضی کے مطابق مرکزی سطح پر جید علمائے کرام پر مشتمل رویت ہلال کمیٹی کی تشکیل کے بعد کیا کسی شہر میں الگ طور پر رویت ہلال کے اہتمام کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ اور اگر اس الگ اہتمام کی صورت میں عوام میں خلفشار پیدا ہوتا ہو تو کیا ایسے الگ اہتمام کو باقی رکھنے کا کوئی جواز ہے؟ اور دوسرا یہ کہ جب مرکزی سطح پر چاند کا اعلان حکومت نہیں بلکہ جید علمائے کرام کی کمیٹی کرتی ہے اور اسے ہی سرکاری اعلان تصور کیا جاتا ہے تو کیا صوبہ سرحد کی حکومت کا اس میں

فریق بن کر اپنی طرف سے فیصلے اور اہتمام کرنا درست ہے؟ فقہ اسلامی کے ایک طالب علم کے طور پر مجھے ان دونوں باتوں سے اختلاف ہے۔ میں انہیں درست نہیں سمجھتا اور اسی وجہ سے سپریم کورٹ آف پاکستان کے پشاور بنچ کے دو معزز ججوں کے ریمارکس کے بارے میں تحفظات رکھتے ہوئے نجم المدارس کلاچی کے فتویٰ کو درست تصور کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں اور بھی بہت سے سوالات ہیں اور اگر کسی صاحب علم نے سنجیدگی کے ساتھ اس طرف توجہ دی تو ان کے بارے میں بھی کچھ معروضات پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(روزنامہ پاکستان، ۲۲/ اکتوبر ۲۰۰۶ء)

—— ۳ ——

قومی ایشوز میں ایم ایم اے کا کردار

عراق پر امریکی حملہ اور ایم ایم اے کے مظاہرے

پاکستان مسلم لیگ (ق) کے صدر چودھری شجاعت حسین نے ایک بیان میں کہا ہے کہ ہم مسلمان بھائیوں کے خون کے بدلے ملنے والے پیسوں پر لعنت بھیجتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی آئی ہے کہ امریکہ نے پاکستان کے ذمے ایک ارب ڈالر کا قرضہ معاف کر دیا ہے جس کے بارے میں بعض سرکاری حلقوں کا کہنا ہے کہ ایسا کر کے امریکہ نے وہ وعدہ پورا کیا ہے جو اس نے دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی عالمی مہم میں اس کا ساتھ دینے کے حوالے سے پاکستانی حکومت کے ساتھ کر رکھا تھا۔ محترم چودھری شجاعت حسین نے یہ بھی کہا ہے کہ عراق پر امریکی حملے کے خلاف لاہور، راولپنڈی، کراچی، ملتان، پشاور اور دیگر شہروں میں جو ملین مارچ ہوئے ہیں، ان میں پاکستان مسلم لیگ کی حمایت بھی شامل تھی اور ہمارے ساتھی بھی اس میں شریک ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ متحدہ مجلس عمل اسے سیاسی مسئلہ نہ بنائے اور اس سے سیاسی فوائد حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔

ہمیں چودھری صاحب کے اس ارشاد سے اتفاق ہے کہ عراق پر امریکی حملہ کے خلاف ملین مارچ کے ان پروگراموں کی کال اگرچہ متحدہ مجلس عمل نے دی ہے، لیکن اس میں تمام طبقات کے لوگ شریک ہو رہے ہیں اور ان مظاہروں کے ذریعے سے پوری قوم نے متفقہ طور پر یہ عوامی فیصلہ دے دیا ہے کہ پاکستانی قوم بحیثیت قوم عراق پر امریکی اتحاد کے حملے کی مذمت کرتی ہے، اسے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ تصور کرتی ہے اور پاکستان کے عوام اس جنگ میں عراق کے مظلوم اور غیور عوام کے ساتھ ہیں۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے، وہ تو امریکی حملے کے خلاف پوری

طرح متحد ہیں اوران کی آواز ایک ہے،لیکن ہماری سیاسی قیادت کی ترجیحات بہرحال اپنی جگہ موجود ہیں اور ہر باشعور شہری کو نظر آ رہی ہیں۔ پاکستان مسلم لیگ (ق) اس وقت ملک کی مقتدر جماعت ہے اوراس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ پاکستانی عوام کی اکثریت کی نمائندگی کرتی ہے۔اس حوالے سے عراق پر امریکی یلغار کے خلاف عوامی جذبات کو منظّم کرنے کے زور پر عوامی مہم کی قیادت کرنے کی ذمہ داری اس کی بنتی ہے،مگر چوہدری شجاعت حسین یہ فرما کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہم بھی تو مجلس عمل کے ساتھ ہیں اور ہم بھی مسلمان بھائیوں کے خون کے بدلے ملنے والے پیسوں کو اچھا نہیں سمجھتے اوران پر لعنت بھیجتے ہیں۔

دوسری طرف پاکستان پیپلز پارٹی کا طرز عمل سب کے سامنے ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی ہمیشہ سے عوام کی سیاست کرنے کی دعوے دار رہی ہے اور استعمار دشمنی کے نعروں میں آگے آگے رہتی ہے،لیکن افغانستان اوراس کے بعد عراق کے عوام کے خلاف سامراجی قوتوں اور عالمی استعمار کی کھلم کھلا دہشت گردی کے بارے میں پی پی پی کی قیادت نے جو سیاسی حکمت عملی اپنا رکھی ہے،اس نے عوام دوستی اور سامراج دشمنی کے سارے پردے ایک ایک کر کے اس کے چہرے سے اتار دیے ہیں۔کون نہیں جانتا کہ محترمہ بینظیر بھٹو نے گزشتہ دو سالوں کے دوران امریکہ کے کتنے چکر لگائے ہیں اور امریکی حکام سے بالواسطہ اور بلا واسطہ ملاقاتیں کر کے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں انہیں اعتماد دلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ جنگ جنرل پرویز مشرف کے بجائے وہ زیادہ بہتر طور پر لڑ سکتی ہیں،اس لیے انہیں دوبارہ چانس دیا جائے اور دوبارہ ایسا موقع فراہم کیا جائے کہ وہ بنیاد پرستی اور دہشت گردی کو کچلنے کے لیے امریکہ کے زیر سایہ موثر کردار ادا کرتے ہوئے اپنی سابقہ کوتاہیوں کی تلافی کر سکیں،اوراس حقیقت سے کون آنکھیں بند کر سکتا ہے کہ امریکہ کے خلاف حالیہ عوامی مظاہروں کی قیادت میں آگے نہ آنے میں بھی پی پی پی قیادت کی یہی حکمت عملی کارفرما ہے کہ کہیں امریکہ بہادر اس قدر ناراض نہ ہو جائے کہ اس کے بعد کوئی اور چانس ملنے کا امکان ہی باقی نہ رہے۔

اس پس منظر میں اگر متحدہ مجلس عمل نے آگے بڑھ کر امریکہ کے مخالف مظاہروں کی کال دی ہے،انہیں منظّم کرنے کے لیے محنت کی ہے اوران کی قیادت کر کے عوامی جذبات کو سیاسی زبان دی

ہے تو اسے اس کے کریڈٹ اور سیاسی فوائد سے محروم کرنا اور ''سیاست'' کا طعنہ دے کر اس کی اہمیت کو کم کرنا چودھری شجاعت حسین جیسے سنجیدہ سیاست دان کے لیے کسی درجے میں بھی مناسب نہیں ہے۔ چودھری صاحب ملک کی مقتدر سیاسی جماعت کے سربراہ ہیں اور ان کی زبان سے یہ باتیں سن کر ہمیں خوشی ہوتی ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی عراق پر ناجائز طور پر حملہ آور ہیں، یہ سراسر ظلم ہے، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ جنگ ہے اور ہم اس حملہ کی مذمت کرتے ہیں۔ پھر چودھری صاحب کا یہ ارشاد بھی ہمارے لیے خوشی کا باعث بنا ہے کہ ہم مسلمانوں کے خون کے بدلے ملنے والی رقم پر لعنت بھیجتے ہیں، لیکن ملک کے مقتدر ترین سیاستدان کی حیثیت سے ان سے ہمارا سوال ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے پاکستان کو قرضوں میں جو معافیاں اور سہولتیں مل رہی ہیں اور مزید امداد کے جو وعدے ہو رہے ہیں، وہ کس چیز کا معاوضہ ہیں؟ اور امریکہ اور اس کے اتحادی پاکستان پر اس قدر مہربان کیسے ہو گئے ہیں کہ اسلام آباد کو اٹھتے بیٹھتے آمریت اور ڈکٹیٹر شپ کا طعنہ دینے والی حکومتیں اچانک قرضے معاف کرنے، انہیں ری شیڈول کرنے اور نئے قرضے دینے کے لیے کس لیے تیار نظر آتی ہیں؟ کیا اس کے پیچھے اپنے مسلمان بھائیوں کا خون چودھری صاحب کو نظر نہیں آ رہا؟ پھر عراقی بھائیوں پر بموں کی مسلسل بارش کے دوران اور عراقی بھائیوں کی تڑپتی لاشوں اور کٹتے جسموں کے تناظر میں پاکستان کو ایک ارب ڈالر کے قرضے کی معافی کی ''خوشخبری'' دینے کا کیا مطلب ہے؟ چودھری صاحب زمیندار ہیں، جاٹ ہیں اور پنجاب کے جاٹوں کی تاریخی روایات کے امین ہیں اور دوستیاں اور دشمنیاں رکھنے والے ڈیرے دار ہیں۔ اگر ان کا مطلب وہ بھی نہیں سمجھتے تو پاکستان میں اور کون ہے جو اس کا مطلب سمجھتا ہوگا؟

چودھری صاحب سے ہماری دوسری گزارش یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے وہ یہ تصور کریں کہ چوہدری ظہور الٰہی مرحوم آج زندہ ہیں اور موجودہ عالمی اور ملکی تناظر کو دیکھ رہے ہیں اور پھر یہ سوچیں کہ کیا آج کے حالات کے تناظر میں چودھری ظہور الٰہی مرحوم کا کردار یہی ہوتا جو آج ان کا خاندان ادا کر رہا ہے؟ ہم چودھری ظہور الٰہی مرحوم کو جانتے ہیں۔ ہم نے ان کے ساتھ سالہا سال تک سیاسی کام کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر چودھری ظہور الٰہی مرحوم آج موجود ہوتے تو امریکہ کے خلاف

عوامی مظاہروں اور عالم اسلام کو امریکہ کے خلاف متحد کرنے کی مہم کا پرچم ان کے ہاتھ میں ہوتا اور وہ منہ میں ''گھنگھنیاں'' ڈال کر دبے لفظوں میں صرف یہ نہ کہہ رہے ہوتے کہ ''ہم بھی تو ساتھی ہی ہیں''۔ یہ صرف چودھری صاحب کی بات نہیں ہے، بلکہ اس حوالہ سے ہمارے جذبات اور احساسات یہ ہیں کہ آج ذوالفقار علی بھٹو، جنرل ضیاء الحق مرحوم، چودھری ظہور الٰہی مرحوم میں سے کوئی بھی زندہ ہوتا تو ان کا کردار یقیناً وہ نہ ہوتا جو ان کی جانشینی کی دعوے دار اولاد ادا کر رہی ہے اور ایک باحوصلہ، مدبر اور غیرت مند قیادت کی موجودگی قوم کے لیے یقیناً اطمینان اور اعتماد کا باعث ہوتی۔ اس پس منظر میں اگر مفتی محمود کا بیٹا اپنے باپ کی روایات کو قائم رکھے ہوئے ہے اور اسے دیکھ کر عوام کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر آج کے حالات میں مفتی محمود زندہ ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے جو ان کا بیٹا کر رہا ہے تو چودھری صاحب کو اسے ''سیاست بازی'' کا طعنہ دینے کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ اس نے نہ صرف اپنے باپ کی روایات کا پرچم تھام رکھا ہے بلکہ وہ چودھری شجاعت حسین کے والد محترم کی جرات و حوصلہ کا پرچم بھی اٹھائے ہوئے ہے۔

چودھری شجاعت حسین ایک محترم سیاسی لیڈر ہیں، ہمارے انتہائی محترم بزرگ دوست کے بیٹے ہیں اور ان سے ہمیں بہت سی توقعات ہیں جن میں سے سب سے بڑی توقع یہ ہے کہ اے کاش کہ وہ آمریت کو برسرعام للکارنے والا ظہور الٰہی بنیں، مچھ جیل والا ظہور الٰہی، بلوچستان کے مظلوم کی حمایت میں آواز بلند کرنے والا ظہور الٰہی اور آمریت کو برسرعام للکارنے والا ظہور الٰہی! کیونکہ آج پنجاب کو اسی ظہور الٰہی کی ضرورت ہے جو ملک کے اس سب سے بڑے صوبے پر آمریت کے شکنجے کو مزید قوت بخشنے کے بجائے اپنی توانائیاں اس شکنجے کو توڑنے میں صرف کر سکے۔

(روزنامہ اوصاف، ۱۰/اپریل ۲۰۰۳ء)

ایل ایف او اور متحدہ مجلس عمل کی شرائط

ایل ایف او پر حکومت اور متحدہ مجلس عمل سمیت اپوزیشن کے تنازع نے مولانا فضل الرحمٰن کی طرف سے ان شرائط کے اعلان کے بعد ایک نئی شکل اختیار کر لی ہے کہ اگر حکومت ملک میں:

۱۔ قرآن وسنت کو سپریم لا تسلیم کرلے،

۲۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق قانون سازی کا اہتمام کرے،

۳۔ جمعہ کی چھٹی بحال کردے،

۴۔ بلاسود بینکاری کا آغاز کرے اور

۵۔ تعلیمی اداروں کی نج کاری روک دے

تو متحدہ مجلس عمل ایل ایف او کے بارے میں اپنے موقف میں لچک پیدا کرسکتی ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن نے یہ اعلان کوئٹہ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کیا ہے، جبکہ اس سے قبل صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت نے شرعی قوانین کے نفاذ کے عملی اعلانات کا آغاز کر دیا ہے جس پر بین الاقوامی نشریاتی اداروں کے تبصروں اور حکومتی حلقوں کے بعض ذمہ دار حضرات کے ردعمل کے تناظر میں قومی سطح پر اس وقت جاری سیاسی کشمکش ایک نیا رخ اختیار کرتی نظر آ رہی ہے۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں بھی ملک کے دینی حلقوں کو اسی قسم کی صورت حال کا سامنا تھا۔ صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے مارشل لا کے دور میں سپریم کورٹ آف پاکستان کی اجازت سے دستور میں بہت سی ترامیم کر رکھی تھیں جن میں صدر کے اختیارات میں اضافہ اور ملکی نظام کو عملی

طور پر صدارتی طرز پر ڈھالنے کے ساتھ ساتھ بعض اسلامی ترامیم کے اقدامات بھی شامل تھے۔ جب انہوں نے ۸۵ء میں غیر جماعتی الیکشن کرائے تو انھوں نے قومی اسمبلی سے اپنی آئینی ترامیم کی منظوری حاصل کرنے اور انہیں باضابطہ دستوری حیثیت دینے کا راستہ اختیار کیا۔ انہیں اس سلسلے میں خاصی محنت کرنا پڑی اور مختلف حربوں سے کام لینا پڑا۔ اس وقت قومی اسمبلی میں ''شریعت گروپ'' کے نام سے ایک گروپ قائم ہو گیا تھا جس نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے جو آئینی ترامیم کی ہیں، ان میں اسلامائزیشن سے متعلقہ ترامیم متاثر نہ ہوں بلکہ انہیں یقینی بنانے کے لیے پارلیمنٹ سے قرآن وسنت کو دستوری طور پر ملک کا سپریم لاقرار دلوایا جائے۔

صدر ضیاء الحق مرحوم کی آئینی ترامیم میں جہاں صدارتی اختیارات میں اضافہ اور اس نوعیت کی دیگر سیاسی دفعات شامل تھیں، وہاں خدا تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کے اعلان پر مشتمل قرارداد مقاصد کو دستور کا واجب العمل حصہ قرار دینے کی ترمیم، وفاقی شرعی عدالت کے قیام اور حدود آرڈیننس کے نفاذ کی ترامیم بھی موجود تھیں۔ یہ تمام دستوری ترامیم اسلامائزیشن کے حوالے سے بہت زیادہ اہمیت کی حامل تھیں، اس لیے ان کا تحفظ ضروری تھا۔ چنانچہ قومی اسمبلی کے بہت سے ارکان نے شریعت گروپ کی صورت میں صدر ضیاء الحق مرحوم کی طرف سے کی جانے والی دستوری ترامیم کو دستور کا باضابطہ حصہ بنانے کے لیے اس شرط پر آمادگی ظاہر کی کہ اسلامائزیشن سے تعلق رکھنے والی ترامیم کو بھی تحفظ دیا جائے اور اس کے ساتھ قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لاقرار دیا جائے۔ چنانچہ آٹھویں ترمیمی بل کی صورت میں قرارداد مقاصد، وفاقی شرعی عدالت، حدود آرڈیننس اور صدارتی اختیارات سمیت صدر ضیاء الحق مرحوم کی تمام ترامیم کو دستور کا حصہ بنا دیا گیا اور قرآن وسنت کو سپریم لاقرار دینے کے لیے قومی اسمبلی نے ایک الگ قرارداد کی صورت میں قوم سے وعدہ کیا کہ جلد ایک مستقل آئینی ترامیم کے ذریعے سے قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لاقرار دے دیا جائے گا۔

اس کے بعد سینٹ آف پاکستان میں مولانا سمیع الحق اور مولانا قاضی عبد اللطیف نے قومی اسمبلی کے اسی متفقہ وعدہ کی بنیاد پر ''شریعت بل'' پیش کیا جس کی سب سے اہم دفعہ قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لاقرار دینے کی تھی۔ اس شریعت بل پر کئی برس تک بحث جاری رہی، ملک بھر میں

اس کے حق میں اور مخالف وسیع پیمانے پر قومی مباحثہ ہوا۔ بہت سی مذہبی اور سیاسی جماعتوں نے اس کی مخالفت بھی کی۔ اس کے لیے سینٹ آف پاکستان کے چیئرمین غلام اسحاق خان نے ملک میں رائے عامہ معلوم کرنے کا حکم دیا جس کے جواب میں اس قدر خطوط موصول ہوئے کہ سینٹ کے ریکارڈ کے مطابق اس سے قبل کسی سوال نامے پر اتنی تعداد میں جوابات موصول نہیں ہوئے تھے۔ ہر سطح پر وسیع تر قومی مباحثے کے بعد ملک کی اہم سیاسی و دینی جماعتیں اس کی حمایت میں متحد ہوئیں اور راولپنڈی کے فلیش مین ہوٹل میں مولانا فضل الرحمٰن اور میاں نواز شریف سمیت بڑے بڑے رہنماؤں نے شریک ہو کر اس کی حمایت کا اعلان کیا اور بالآخر سینٹ آف پاکستان نے شریعت بل منظور کر لیا۔ اس کے بعد ضابطہ کے مطابق شریعت بل کو قومی اسمبلی میں نوے دن کے اندر پیش ہونا تھا مگر اس سے قبل اسمبلی ٹوٹ گئی اور اس قدر طویل اور ہمہ گیر جدوجہد کے بعد سینٹ آف پاکستان سے منظور ہونے والا شریعت بل، جس کا سب سے بڑا مقصد قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لا قرار دینا تھا، ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔

یہ دور بے نظیر بھٹو کا تھا جن کے بعد میاں نواز شریف برسر اقتدار آئے اور ان کے دور میں قومی اسمبلی میں ایک شریعت بل پیش ہوا جو منظور بھی ہو گیا مگر اس میں قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لا قرار دینے کی بنیادی دفعہ کو اس شرط کے ساتھ مشروط کر کے غیر موثر کر دیا گیا کہ ''اس سے ملک کا سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچہ متاثر نہیں ہوگا۔'' ظاہر بات ہے کہ اس شرط کے بعد قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لا قرار دینے کے اس فیصلے کی کوئی افادیت باقی نہیں رہ گئی تھی، اس لیے اس کا بھی کوئی عملی نتیجہ سامنے نہ آیا۔ کہا جاتا ہے کہ ملک کے سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچے کو قرآن وسنت کی بالادستی کے دائرہ سے باہر رکھنے میں سب سے زیادہ دلچسپی اسلام آباد میں امریکی سفارت خانہ نے ظاہر کی اور اس کی درپردہ مساعی سے یہ سب کچھ ظہور پذیر ہوا۔

اس کے بعد مختلف مواقع پر قرآن وسنت کی دستوری بالادستی کے لیے آواز اٹھائی جاتی رہی مگر کسی طرف سے شنوائی نہیں ہوئی۔ اب اگر متحدہ مجلس عمل نے صدر جنرل پرویز مشرف کے ساتھ سیاسی بارگیننگ کے دوران اس مسئلہ کو دوبارہ اعلیٰ سطح پر اٹھایا ہے تو اگرچہ میرے جیسے نظریاتی

کارکنوں کے لیے یہ بات انتہائی تکلیف دہ ہے کہ اسلامائزیشن کی طرف کسی بھی پیش رفت کا موقع آخر سیاسی سودے بازی کے حوالے سے ہی کیوں سامنے آتا ہے اور ملک کے مقتدر سیاسی حلقے اسے خود اپنی دینی وملی ذمہ داری سمجھنے کے لیے کیوں تیار نہیں ہیں، مگر اس کے باوجود ہماری خواہش ہے کہ متحدہ مجلس عمل کو اس مہم میں کامیابی حاصل ہو اور خدا کرے کہ وہ صدر جنرل پرویز مشرف کو اس بات کا قائل کرنے میں کامیاب ہو جائے کہ اگر وہ اپنی ذات، صدارت اور وردی کو ملک کے لیے ناگزیر تصور کرتے ہیں تو اسلام اس سے کہیں زیادہ ملک کے لیے ناگزیر ہے۔ پاکستان کی بنیاد ہی اسلام پر ہے اور اسلام کے بغیر پاکستان کے جداگانہ تشخص اور ایک الگ ملک کے طور پر اس کے وجود کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔

متحدہ مجلس عمل کی دیگر شرائط بھی اسی نوعیت کی ہیں۔ مثلاً اسلامی نظریاتی کونسل ملک کا دستوری ادارہ ہے جس نے دستور پاکستان کی طرف سے تفویض کردہ ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے ملک کے تمام مروجہ قوانین کا جائزہ لے کر انہیں اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے سفارشات مکمل کر کے انہیں حکومت کو پیش کر دیا ہے اور حکومت دستوری طور پر انہیں قومی اسمبلی میں پیش کر کے ان کے مطابق قانون سازی کی پابند ہے۔ اس صورت میں یہ شرط یا تجویز کوئی نیا مطالبہ نہیں بلکہ حکومت کو اس کی دستوری ذمہ داری کی طرف توجہ دلانے کی ایک کوشش ہے اور ہمارے خیال میں حکومت کو اس میں بھی کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔ البتہ صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم اور جنرل پرویز مشرف کی دستوری ترامیم میں دو فرق موجود ہیں۔ ایک یہ کہ صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم کی دستوری ترامیم میں اسلامائزیشن سے متعلقہ اہم ترامیم بھی شامل تھیں جن کے تحفظ میں ملک کے دینی حلقوں کی اپنی دلچسپی موجود تھی جبکہ جنرل پرویز مشرف کی تمام ترامیم سیاسی نظام اور صدارتی اختیارات کے حوالہ سے ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ صدر ضیاء الحق مرحوم نے اپنی ترامیم کو حرف آخر قرار نہیں دیا تھا بلکہ انہیں منتخب قومی اسمبلی سے منظور کرانے کا راستہ اختیار کیا تھا جو ایک جائز اور معقول بات تھی مگر صدر جنرل پرویز مشرف اپنی دستوری ترامیم کو حرف آخر قرار دے کر قومی اسمبلی کو ان پر غور تک کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں اور خود اپنی ذات کو ہی دستور اور دستوری اداروں کے مترادف قرار دینے پر مصر

ہیں۔اس پس منظر میں متحدہ مجلس عمل کی یہ مہم زیادہ کٹھن اور صبر آزما ہے اور اس کے آگے بڑھنے میں کامیابی کے محدود امکانات کے ساتھ ساتھ خطرات وخدشات کا ایک خطرناک صحرا بھی سامنے دکھائی دے رہا ہے۔

قرآن وسنت کو ملک کا بالاتر قانون قرار دینے اور اسلامائزیشن کی طرف کسی بھی حوالے سے پیش رفت کی کوئی بھی کوشش ہو تو اسے بہرحال ملک کے دینی حلقوں اور نفاذ اسلام کی خواہش رکھنے والے عوام کی حمایت حاصل ہوگی۔ خدا کرے کہ کوئی کوشش اس سلسلے میں بھی بارآور ہو اور ملک صحیح معنوں میں ایک اسلامی ریاست کی حیثیت اختیار کر سکے، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، ۴؍جون ۲۰۰۳ء)

تحفظ نسواں بل سے متعلق علما کمیٹی کی سفارشات

حدود آرڈیننس میں ترامیم بل کے حوالے سے جو بحران پیدا ہوتا نظر آرہا تھا، وہ بحمد اللہ پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سربراہ چودھری شجاعت حسین اور قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف مولانا فضل الرحمٰن کی خصوصی حکمت عملی اور توجہ کے باعث باہمی افہام وتفہیم کے ساتھ اصولی طور پر رک گیا ہے اور اگر تحفظ حقوق نسواں بل کو قومی اسمبلی میں دوبارہ پیش کرتے وقت کوئی اور الجھن پیدا نہ ہوئی تو امید ہے کہ اس مسئلے پر کوئی نیا بحران کھڑا نہیں ہوگا اور اس کے ملک کی سالمیت پر بھی دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔

پاکستان مسلم لیگ اور متحدہ مجلس عمل کے اس مفاہمتی عمل کے لیے غیر سیاسی علما کی جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی، اس میں راقم الحروف بھی شامل تھا اور سارے مذاکراتی عمل میں شریک رہا۔ اس کے اختتام پر جب پاکستان ٹی وی نے میرے تاثرات دریافت کیے تو میں نے عرض کیا کہ مجھے دو باتوں پر خوشی ہوئی ہے۔ ایک اس بات پر کہ حکمران پارٹی اور متحدہ مجلس عمل نے اس اہم مسئلے پر محاذ آرائی کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے مفاہمت کے ساتھ یہ مسئلہ حل کرنے کو ترجیح دی ہے اور دوسری بات میرے لیے خوشی کی یہ ہے کہ اس عمل کے نتیجے میں دنیا کو ایک بار پھر یہ پیغام مل گیا ہے کہ پاکستان اپنے اسلامی تشخص پر اور قرآن وسنت کے ساتھ وفاداری کے عہد پر بدستور قائم ہے اور آج کے عالمی ماحول میں میرے نزدیک یہ بات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

حدود آرڈیننس میں ترامیم کا یہ مسودہ جو تحفظ حقوق نسواں بل کے عنوان سے قومی اسمبلی میں

زیر بحث ہے اور جس میں قرآن وسنت کے منافی دفعات کی نشاندہی اور اصلاح کے لیے علمائے کرام کی یہ کمیٹی بنائی گئی تھی، دراصل اس طویل نظریاتی اور تہذیبی کشمکش کا ایک حصہ ہے جو پاکستان کے نظریاتی اسلامی تشخص کے تحفظ اور پاکستانی معاشرے میں اسلامی اقدار وروایات کی بقا، یا انہیں کمزور کر کے مغربی ثقافت وتمدن کو رواج دینے کے لیے ایک عرصہ سے جاری ہے اور ایک عرصہ تک جاری رہے گی۔ ایک سیکولر دانشور کے نزدیک یہ ''نان ایشو'' ہے لیکن اگر یہ مہم کامیاب ہو جاتی اور ترمیمی بل کے منظور ہو جانے کی صورت میں حدود آرڈیننس محض شوپیس بن کر رہ جاتا تو یہی مسئلہ ہمارے ان دانشوروں کے ہاں ''کرنٹ ایشو'' قرار پاتا اور اسے سولائزیشن اور آزادی کی طرف تاریخی قدم قرار دے کر اس کے حق میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیے جاتے۔

مذاکرات کے اس عمل کا آغاز اس طرح ہوا کہ چودھری شجاعت حسین اور مولانا فضل الرحمٰن کے درمیان ایک ملاقات میں اس بات پر اتفاق رائے ہو گیا کہ کچھ ایسے علما کو بھی حدود آرڈیننس میں اور تحفظ حقوق نسواں بل پر مباحثہ میں شریک کر لیا جائے جو عملی سیاست میں فریق نہ ہوں اور جن کی رائے کو قبول کرنے میں فریقین میں سے کسی کو بھی اختلاف نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے جن علما کے ناموں پر اتفاق رائے ہوا، ان میں جسٹس (ر) مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا حسن جان، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا مفتی منیب الرحمٰن، مولانا مفتی غلام الرحمٰن، ڈاکٹر سرفراز نعیمی اور راقم الحروف شامل ہیں۔ مجھے جب اس بات کی اطلاع دی گئی تو میں نے عرض کیا کہ میرے لیے یہ اعزاز اور سعادت کی بات ہے۔ چودھری شجاعت حسین صاحب نے خود فون پر مجھ سے بات کر کے دریافت کیا تو میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ اگرچہ بعض دوستوں کی طرف سے یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ ان علمائے کرام کے لیے غیر سیاسی، غیر جانبدار اور سرکاری علما کی جو اصطلاحات قومی اخبارات میں استعمال کی گئی ہیں، کیا میرے لیے وہ قابل قبول ہیں؟ اس پر میں نے عرض کیا کہ اس کا تعلق معروضی حالات اور ملی ضروریات سے ہے اور ان دونوں کے تقاضے یکجا ہو جائیں تو مجھے ان میں سے کسی بات میں بھی تامل نہیں ہے۔ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے، میں سیاست کو دین کا ایک شعبہ اور دینی ضروریات کا ایک اہم حصہ سمجھتا ہوں۔ اس سے دست برداری یا لاتعلقی میرے نزدیک

دین کے ایک حصے سے لاتعلقی ہے، البتہ یہ تقسیم کار کی بات ہے کہ اقتدار اور الیکشن کی سیاست کے لیے خود کو موزوں نہ سمجھتے ہوئے نفاذ اسلام کی جدوجہد کے فکری اور علمی شعبے کو میں نے اپنی تگ وتاز کا میدان بنایا ہوا ہے۔

میں ۱۹۶۵ء سے ۱۹۹۰ء تک عملی انتخابی اور جماعتی سیاست کا ایک متحرک کردار رہا ہوں جبکہ ۱۹۹۰ء کے بعد سے فکری اور علمی شعبے میں مصروف عمل ہوں۔ اسے اگر غیر سیاسی ہونا کہا جاتا ہے تو ایسا کہنے والوں سے میں کیا عرض کرسکتا ہوں؟ باقی رہی بات غیر جانبداری کی تو حکومت اور اپوزیشن یا سیاسی جماعتوں کے سیاسی جھگڑوں اور پاور پالیٹکس میں تو غیر جانبدار ہوسکتا ہوں اور کسی حد تک ہوں بھی، مگر دینی وملی مسائل کے بارے میں غیر جانبدار ہونا میرے لیے ممکن ہی نہیں ہے، بالخصوص اسلامائزیشن سے متعلقہ امور میں غیر جانبدار ہوجانا تو شاید بعض صورتوں میں کفر کی حدود تک بھی پہنچا دیتا ہے، البتہ سرکاری علما کی پھبتی بالکل خلاف واقعہ ہے اس لیے کہ ان علما کے نام صرف حکمران پارٹی کی طرف سے نہیں آئے بلکہ قائد حزب اختلاف کی رضامندی بھی اس میں شامل تھی، یہی وجہ ہے کہ تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں ان علمائے کرام نے جو سفارشات دی ہیں، ان میں انہوں نے اپنے کام کے حوالے سے دونوں کا تذکرہ کیا ہے۔

میں اس سارے معاملے کو ایک اور حوالے سے بھی دیکھتا ہوں کہ یہ معاملہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور چودھری ظہور الٰہی مرحوم کے بیٹوں کے درمیان ہوا ہے۔ ان دونوں راہنماؤں میں ایک عرصہ تک رفاقت رہی ہے، بالخصوص ۷۴ء کی تحریک ختم نبوت اور ۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ میں مولانا مفتی محمودؒ اور چودھری ظہور الٰہی مرحومؒ کا قائدانہ کردار تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ چودھری صاحب مرحوم کٹر مسلم لیگی تھے اور ان کا سیاسی مزاج بھی خالصتاً مسلم لیگی تھا، لیکن یہ میرے ذاتی مشاہدے کی بات ہے کہ ملک کے اسلامی تشخص اور دینی امور کے حوالے سے وہ دوٹوک رائے رکھتے تھے اور ان کے بارے میں عملی طور پر بے لچک ہو جایا کرتے تھے۔ یہ خوبی ان کے سیاسی جانشینوں چودھری شجاعت حسین اور چودھری پرویز الٰہی میں بھی پائی جاتی ہے اور مختلف مواقع پر دیکھا گیا ہے کہ قومی وحدت، ملکی سیاست، پاکستان کے اسلامی تشخص اور دینی احکام وروایات کے تحفظ

کے بارے میں جو تقاضا ان کی سمجھ میں آ گیا ہے، اس میں انہوں نے کوئی لچک نہیں دکھائی۔

بہر حال اس پس منظر میں مذکورہ بالا علمائے کرام کے ساتھ میں بھی اسلام آباد حاضر ہوا اور حدود آرڈیننس میں ترامیم کے لیے ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کے عنوان سے قومی اسمبلی میں پیش کیے جانے والے نئے مسودہ قانون پر بحث ومباحثہ میں شرکت کی۔ یہ گفتگو ان علمائے کرام کی وزارت قانون کے اعلیٰ ترین افسران کے ساتھ ہوئی۔ اس میں چودھری شجاعت حسین، چودھری پرویز الٰہی، سردار نصر اللہ دریشک اور دوسرے اہم حضرات بھی مسلسل شریک رہے۔ علمائے کرام نے مذاکرات کے آغاز سے قبل آپس میں دو باتیں طے کر لیں۔ ایک یہ کہ پاکستانی معاشرے میں عورت کی مظلومیت اور حقوق کے بارے میں اصل اور عملی مسائل کے بارے میں بھی حکومت کو توجہ دلائی جائے اور چند اہم امور کی نشان دہی کر کے حکومت سے کہا جائے کہ انہیں اس مسودہ قانون میں شامل کیا جائے یا ان کے لیے الگ قانون سازی کی جائے۔ یہ امور درجہ ذیل ہیں:

☆ ہمارے معاشرے میں عام طور پر عورتوں کو وراثت میں ان کا حصہ نہیں ملتا اور وہ خاندانی یا معاشرتی دباؤ کی وجہ سے خاموش رہ کر اپنے حق سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے قانون سازی کی ضرورت ہے۔

☆ عام طور پر عورتوں کو ان کا مہر بھی نہیں ملتا۔ یا تو کسی حیلے بہانے سے معاف کرا لیا جاتا ہے یا وہ مہر لڑکی کا باپ وصول کر لیتا ہے اور لڑکی کو نہیں ملتا۔ اس کا بھی قانونی طور پر سد باب ضروری ہے۔

☆ بیک وقت تین طلاقیں دے دینا شرعاً بھی ناپسندیدہ ہے اور اس سے بہت سے خاندانی اور معاشرتی مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں، اس لیے موجودہ حالات میں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ یک بارگی تین طلاقیں دینے کو قانوناً قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے اور اس میں وثیقہ نویسوں اور عرضی نویسوں کو بھی شریک جرم بنایا جائے۔

☆ جبری وٹہ سٹہ جسے شریعت نے ''نکاح شغار'' کا نام دیا ہے، اس کی بھی قانونی ممانعت کی جائے۔

☆ بالغ لڑکی کی مرضی کے خلاف اس کے جبری نکاح کو قانوناً قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے۔

☆ قرآن کریم کے ساتھ نکاح کی مذموم رسم کا خاتمہ کیا جائے۔

☆ کاروکاری اور اس طرح کے دیگر غیر شرعی رسوم ورواج کے خاتمے کے لیے قانون سازی کی جائے۔

دوسری بات جو علمائے کرام نے اس میں طے کی تھی، یہ تھی کہ دو تین اصولی اور اہم امور کو پہلے زیر بحث لایا جائے۔ اگر حکومت ان کے بارے میں ہماری بات قبول کرنے کو تیار ہو تو باقی امور پر بات کی جائے، ورنہ مسودہ قانون پر مزید بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان میں تین باتیں ہمارے نزدیک زیادہ اہمیت رکھتی ہیں:

(۱) زنا بالجبر کو نئے مسودہ میں حدود شرعیہ سے نکال کر تعزیر میں شامل کر دیا گیا ہے جو قطعی طور پر غلط ہے۔ اسے حدود میں واپس لایا جائے اور اس کی سزا رجم ہی رکھی جائے۔

(۲) زنا بالرضا میں شرعی شہادتیں پوری ہونے کی صورت میں اس کی سزا حد شرعی یعنی رجم رکھی گئی ہے، لیکن شہادت کا نصاب مکمل نہ ہونے کی صورت میں زنا سے متعلقہ دیگر جرائم کو تعزیرات سے بھی نکال دیا گیا ہے۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ زنا بالرضا کا اگر شرعی ثبوت نہ بھی مل سکے تو اس سے متعلقہ جو جرائم ثابت ہو چکے ہوتے ہیں، مثلاً مرد اور عورت کی ناجائز خلوت اور دیگر دواعی زنا، ان کے تعزیری احکام کو بحال کیا جائے۔

(۳) حدود آرڈیننس کو باقی قوانین پر بالاتر حیثیت دی گئی تھی، اسے نئے مسودہ قانون میں ختم کر دیا گیا ہے۔ اسے دوبارہ بحال کیا جائے۔

ان تینوں امور پر ہمارا موقف بحمد اللہ تسلیم کر لیا گیا، اس طرح کہ زنا بالجبر کو دوبارہ حدود شرعیہ کے دائرہ میں واپس لے جانے کا فیصلہ ہوا، زنا بالرضا سے متعلقہ قابل تعزیر جرائم کو جرائم کی فہرست میں دوبارہ شامل کرنے کے لیے تعزیرات پاکستان میں ایک نئی تعزیری دفعہ کا اضافہ تجویز ہوا جس کا متن بھی باہمی مشورے سے طے ہو گیا جبکہ حدود شرعیہ کے قانون کی بالادستی کے لیے ایک متبادل شق کا متن طے کیا گیا جو مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کی رائے میں پہلی دفعہ سے زیادہ بہتر اور واضح ہے۔ ان

امور پر اتفاق رائے کو تحریری شکل میں لایا گیا جس میں علمائے کرام نے واضح کیا کہ یہ رائے صرف ان امور کے بارے میں ہے۔ باقی معاملات میں اگر رائے طلب کی گئی تو وہ بعد میں دی جاسکتی ہے۔ اب ان سفارشات کی روشنی میں وزارت قانون تحفظِ حقوق نسواں بل کے قومی اسمبلی میں پیش کردہ مسودہ میں کیسی ترامیم لاتی ہے، ایک دو روز میں یہ بات بھی واضح ہو جائے گی۔

(روزنامہ پاکستان، ۱۵ ستمبر ۲۰۰۶ء)

’مجلس تحفظ حدود اللہ‘ کا قیام اور متحدہ مجلس عمل کی ریلی

’’تحفظ حقوق نسواں بل‘‘ کے بارے میں اسلامی نظریہ کونسل کی حالیہ رائے، مختلف مکاتب فکر کے علمائے کرام کی طرف سے ’’مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان‘‘ کے قیام کے ساتھ اس بل کے خلاف جدوجہد کے اعلان اور متحدہ مجلس عمل کی لاہور سے گجرات تک ریلی کے بعد اس سلسلے میں صورت حال خاصی دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔..... ملک کے تمام معروف دینی حلقے ’’تحفظ حقوق نسواں بل‘‘ کے خلاف صف آرائی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ جامعہ اشرفیہ لاہور میں ۲۷ نومبر کو منعقد ہونے والے ’’تحفظ حدود اللہ کنونشن‘‘ میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور اہل تشیع کے سرکردہ علمائے کرام نے مجتمع ہو کر اس بل کے خلاف بھرپور یک جہتی کا اظہار کیا ہے، جبکہ جامعہ نعیمیہ لاہور میں اس کے دو روز بعد بریلوی مکتب فکر کے علمائے کرام بھی انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنا موقف تسلسل کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بطور خاص نوٹ کرنے کی ہے کہ حکومتی حلقے ملک بھر میں کسی جگہ بھی دینی مکاتب فکر کے معروف حلقوں میں سے کسی ایک عالم دین کی حمایت بھی اس بل کے لیے حاصل نہیں کر سکے اور تمام مکاتب فکر اس مسئلے میں مکمل اتحاد اور ہم آہنگی کا اظہار کر رہے ہیں۔

’’مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان‘‘ کا قیام اسی یک جہتی کے اظہار کی عملی صورت ہے جسے پورے ملک میں ضلعی سطح پر منظم کرنے کا پروگرام بنایا جا رہا ہے۔ ۱۰ دسمبر کو کراچی میں تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام، مشائخ عظام اور دینی کارکنوں کے بھرپور اور نمائندہ کنونشن کا اعلان کر دیا گیا ہے

جس میں ''مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان'' کے تنظیمی ڈھانچے اور آئندہ جدوجہد کے لائحہ عمل کا فیصلہ کیا جائے گا۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری اس سلسلے میں متحرک کردار ادا کر رہے ہیں اور ہمارا اندازہ ہے کہ جن لائنوں پر وہ کام کر رہے ہیں، اگر اس کا تسلسل جاری رہا تو وہ تحریک تحفظ ختم نبوت کی طرز پر ملک کے دینی حلقوں کو متحد کرنے اور سڑکوں پر لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اب متحدہ مجلس عمل کی ریلی کے معاملات پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ حکومتی حلقوں نے اسے ناکام قرار دیا ہے لیکن اس ''ناکامی'' کے لیے صوبائی حکومت کو جو پاپڑ بیلنے پڑے ہیں، اس پر لاہور سے گجرات تک کے عوام عینی شاہد ہیں۔ خود میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ مجھے اس روز پسرور سے سیالکوٹ جانے والے راستے پر واقع گاؤں ''لوہار کے'' میں ظہر کے بعد طالبات کے ایک مدرسے میں بخاری شریف کے سبق کے آغاز کی تقریب میں شریک ہونا تھا۔ وہیں کے ایک دوست گاڑی پر مجھے وہاں لے گئے۔ جب ہم پسرور پہنچ کر سیالکوٹ روڈ کی طرف مڑے تو پولیس کے ناکے پر ہمیں روک لیا گیا۔ ناکے کے انچارج پولیس آفیسر کوئی صاحب بہادر قسم کے تھے۔ انہوں نے ایک اہل کار کو بھیجا کہ مولوی صاحب کو کہو کہ انہیں آفیسر بلا رہے ہیں۔ میں نے اپنے میزبان ساتھی سے کہا کہ وہ جا کر صاحب بہادر کی بات سن لیں۔ وہ گئے تو پوچھا گیا کہ آپ لوگ کدھر جا رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ لوہار کے جا رہے ہیں۔ صاحب بہادر نے کہا کہ ادھر تو سیالکوٹ ہے۔ گویا ہمارا سیالکوٹ جانا ان کے نزدیک ''جرم'' تھا۔ ہمارے ساتھی نے جواب دیا کہ ہم لوہار کے جا رہے ہیں اور میں اسی علاقے کا رہنے والا ہوں۔ اس دوست نے عقل مندی سے کام لیا کہ میرا تعارف نہیں کروایا، ورنہ شاید ہماری یہ بات تسلیم نہ کی جاتی کہ ہم واقعی سیالکوٹ نہیں بلکہ لوہار کے جا رہے ہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر ہم نے ڈسکہ کے راستے گوجرانوالہ واپسی کا پروگرام بنایا تو ڈسکہ میں نہر کے پل پر ٹریفک بلاک تھی۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ ناکہ بندی کی وجہ سے پل بلاک ہے اور ادھر سے سردست گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک نکلنے کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ مغرب کے قریب کا وقت تھا، چنانچہ ہم نہر کے ساتھ ساتھ کچے راستے پر چلتے ہوئے نہر کے اگلے پل تک پہنچے اور گلوٹیاں سے ہوتے

ہوئے گوجرانوالہ واپس آ سکے۔

متحدہ مجلس عمل کی ریلی نے لاہور سے جی ٹی روڈ پر گجرات جانا تھا مگر جی ٹی روڈ سے کم از کم پچاس کلومیٹر دور پسرور میں ناکہ بندی کا یہ حال تھا تو خود لاہور، گوجرانوالہ اور گجرات کا کیا حال ہوگا؟ لوہار کے میں دوستوں نے ہمیں بتایا کہ آج ادھر ٹریفک بند ہے اور ان کے بقول ویگن ڈرائیور کو اس ''جرم'' میں پولیس اہلکاروں سے مار پڑی ہے کہ وہ گاڑی سڑک پر کیوں لایا ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود متحدہ مجلس عمل کے سربراہ قاضی حسین احمد نے گوجرانوالہ میں ریلی سے خطاب کیا ہے اور ان کی گرفتاری کے بعد ریلی کے کچھ حضرات تمام تر رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے گجرات تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں تو اسے ''ناکام'' کہنے کا اعزاز چودھری پرویز الٰہی اور جناب محمد علی درانی ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ بہرحال ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کے حوالے سے ایک نئی صورت حال سامنے آ رہی ہے جو اس حوالے سے نئی نہیں ہے کہ دینی حلقے مذہبی اقدار کے تحفظ کے لیے ایک بار پھر متحد ہو کر سامنے آ رہے ہیں۔ اس سے قبل تحفظ ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالتؐ کے لیے کئی بار ایسا ہو چکا ہے، جبکہ امریکی وزارت خارجہ کی ایک حالیہ رپورٹ میں حدود آرڈیننس کو بھی تحفظ ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالتؐ کے قوانین کے ساتھ منسلک کرتے ہوئے حکومت پاکستان پر ان قوانین کے خاتمے کے لیے زور دیا گیا ہے۔ البتہ اس حوالے سے یہ صورت حال ضرور نئی ہے کہ چودھری ظہور الٰہی مرحوم کا خاندان اس بار دینی حلقوں کا ساتھ دینے کی بجائے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہا ہے، حالانکہ چودھری ظہور الٰہی مرحوم تحریک ختم نبوت میں بھی دینی حلقوں کے ساتھ تھے اور تحریک نظام مصطفیٰ کے تو قائدین میں شامل تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ چودھری شجاعت حسین اور چودھری پرویز الٰہی، صدر پرویز مشرف کا قرب حاصل کرنے اور پیپلز پارٹی کو مات دینے کی مہم میں چودھری ظہور الٰہی مرحوم کی روایات سے کہاں تک دامن چھڑا سکتے ہیں۔

(روزنامہ پاکستان، ۴ دسمبر ۲۰۰۶ء)

تحفظ نسواں بل اور مجلس عمل کا کردار

''مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان'' کے کراچی کنونشن کے بعد اس سلسلہ میں جدوجہد نے جو صورتحال اختیار کرلی ہے، وہ بہت سے حوالوں سے غور طلب ہے اور دینی حلقوں سے سنجیدہ توجہ کا تقاضا کررہی ہے۔ حکمران حلقوں نے اس حوالے سے واضح موقف اختیار کرلیا ہے کہ انہوں نے جو کیا ہے، ٹھیک کیا ہے۔ وہ اس کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے خیال میں ''تحفظ حقوق نسواں'' کے عنوان سے نافذ شدہ ایکٹ پر نظر ثانی کی گنجائش ہے۔ گزشتہ دنوں تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علمائے کرام نے مشترکہ طور پر جونئی یادداشت چودھری شجاعت حسین صاحب سے خود مل کر ان کے حوالے کی ہے، اسے بھی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی بلکہ حکمران جماعت نے چودھری صاحب ہی کی زیر صدارت اجلاس میں ''تحفظ حقوق نسواں ایکٹ'' کی ایک قرارداد کے ذریعے تحسین کرتے ہوئے اس پر نظر ثانی کے دروازے کو بند کردیا ہے اور حکمران جماعت کے اس اجلاس کے حوالہ سے جو خبر اخبارات میں شائع ہوئی ہے، اس میں یہ بات کہہ دی گئی ہے کہ منظور شدہ ایکٹ کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ البتہ چودھری شجاعت حسین صاحب نے حقوق نسواں کے تحفظ کے نام سے جو نیا بل اسمبلی میں جمع کرایا ہے، اس کے لیے علمائے کرام سے مشاورت ہوسکتی ہے اور ان کی کچھ تجاویز کو اس میں شامل کیا جاسکتا ہے، حالانکہ اس مجوزہ بل میں جو باتیں شامل کی گئی ہیں وہ دراصل علماء کرام ہی کی وہ تجاویز ہیں جو انہوں نے پاکستانی معاشرہ کے معروضی تناظر میں خواتین کو درپیش حقیقی مسائل کی طرف توجہ دلاتے ہوئے پیش کی تھیں۔ اس طرح محسوس یوں

ہوتا ہے کہ یہ نیا بل لا کر دراصل علمائے کرام کا منہ بند کرنے اور اس کے ذریعے تحفظ حقوق نسواں کے منظور شدہ متنازعہ ایکٹ کو ہضم کرانے کی راہ ہموار کی جارہی ہے جو ایک خطرناک چال ہے اور اس کا مقصد ان امور کے بارے میں علمائے کرام کو خاموش کرانا ہے جو وہ منظور شدہ متنازعہ ایکٹ میں قرآن وسنت کے صریح احکام کی خلاف ورزی کے طور پر قوم کے سامنے لا رہے ہیں۔ مجھ سے گزشتہ روز ایک ذریعے سے دریافت کیا گیا ہے کہ چودھری شجاعت حسین صاحب کے پیش کردہ نئے بل کے بارے میں اگر علمائے کرام کو مشاورت کے لیے بلایا جائے تو آپ کا ردِعمل کیا ہوگا؟ میں نے گزارش کی کہ جب تک منظور شدہ ''حقوق نسواں ایکٹ'' کا تنازعہ صاف نہیں ہوتا اور اس کے بارے میں علمائے کرام کے اعتراضات دور نہیں کیے جاتے، اس وقت تک نئے بل کے بارے میں کوئی بات کرنا درست نہیں ہوگا۔ یہ منظور شدہ ایکٹ کی خلاف اسلام باتوں سے توجہ ہٹانے کی ایک کوشش ہوگی جس سے علمائے کرام کو بہر حال بچنا چاہیے اور ذاتی طور پر میں کسی ایسی مشاورت میں شرکت کے لیے تیار نہیں ہوں جس میں متنازعہ ایکٹ کی خلاف شریعت باتوں پر خاموشی اختیار کرتے ہوئے نئے بل کو قابل قبول بنانے کے لیے گفتگو کا اہتمام کیا گیا ہو۔

متنازعہ ایکٹ کی منظوری کے بعد بعض وفاقی وزرا نے اپنے باس سمیت علمائے کرام اور دینی حلقوں کے بارے میں جو توہین آمیز لب ولہجہ اختیار کر رکھا ہے، وہ بجائے خود ایک مستقل مسئلہ ہے اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ حکمران طبقہ کے نزدیک حدود شرعیہ کو غیر موثر بنانے کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے کہیں زیادہ یہ مسئلہ اہم ہے کہ علمائے کرام کی کردار کشی کی جائے، ان کے خلاف نفرت انگیزی کی مہم کو تیز کیا جائے اور عوامی حلقوں میں دین کی تعبیر وتشریح کے حوالہ سے علمائے کرام کا جو اعتماد موجود ہے، اسے کسی نہ کسی طرح ختم کر کے قرآن وسنت کی تشریح وتعبیر کو آزادانہ ماحول میں ریاستی اداروں اور حکمران طبقہ کی صوابدید کے دائرہ میں شامل کر دیا جائے کہ وہ جب چاہیں، جس طرح چاہیں، قرآن وسنت کے کسی مسئلہ کو اپنی مرضی کے معنی پہنا کر اسے اسلام اور قرآن وسنت کے نام سے ملک کے قانون ونظام کا حصہ بنا سکیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں اس میں کامیابی حاصل ہوتی ہے یا نہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ یہ نہیں ہوگی، اس لیے کہ قرآن کریم اور اس کی زبان تک بلکہ جناب

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعبیرات وتشریحات اور سنت وحدیث تک عام مسلمان کو رسائی میسر ہے اور دینی مدارس کے وسیع تر نیٹ ورک کی برکت سے کوئی بھی مسلمان کسی بھی وقت یہ معلوم کرسکتا ہے کہ قرآن کریم کی فلاں آیت یا فلاں جملے کا ترجمہ کیا ہے، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل کے ساتھ اس کی کیا تشریح کی ہے، صحابہ کرامؓ نے اس پر کس انداز سے عمل کیا ہے اور امت کے جمہور فقہا نے اس کا کیا مطلب ومفہوم سمجھا ہے؟ جب تک ایک عام مسلمان کی ان چاروں امور تک رسائی کے مواقع موجود ہیں، قرآن وسنت کے کسی حکم کی غلط تشریح اور اسے من مانے مفہوم کے ساتھ امت سے قبول کرانے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس کا تجربہ اس سے قبل امت میں بہت دفعہ ہو چکا ہے۔ اب بھی اس ناکام تجربہ کو ایک بار پھر دہرایا جارہا ہے لیکن پہلے کی طرح اب بھی یہ تجربہ کامیابی کی دہلیز پار نہیں کرسکے گا۔

علمائے کرام اور دینی حلقوں کی کردار کشی اور ان کے خلاف منافرت کی مہم بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جو حضرات برطانوی استعمار کے تسلط کے دور میں علمائے کرام اور دینی کارکنوں کے خلاف چلائی گئی مکروہ پراپیگنڈا مہم اور معاشرہ میں انہیں کارنر کرنے کی مسلسل تگ ودو سے واقف ہیں، وہ ہماری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ مہم آج کی مہم سے زیادہ سخت اور صبر آزما تھی اور اس وقت کے محمد علی درانی اور شیر افگن صاحبان کی زبانیں زیادہ لمبی تھیں، جبکہ علمائے کرام اور دینی حلقوں کے پاس اپنے دفاع اور اپنا موقف پیش کرنے کے مواقع آج سے کہیں کم تھے، اس کے باوجود سوسائٹی سے علمائے کرام کا تعلق منقطع کرنے اور انہیں کارنر کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہوسکیں۔ اس لیے ان دو حوالوں سے تو تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر مجھے کچھ زیادہ پریشانی نہیں ہے اور میرا طالب علمانہ وجدان یہ کہتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ قرآن وسنت اور امت کے اجماعی علمی ماضی کے ساتھ نئی پود کا رشتہ اور کمٹمنٹ زیادہ مضبوط ہوگی بلکہ علمائے کرام اور دینی حلقے بھی آزمائش کی اس نئی بھٹی سے گزر کر پہلے سے زیادہ مضبوط پوزیشن حاصل کریں گے۔ میری پریشانی اس جدوجہد میں علمائے کرام کے کردار، طرز عمل اور حکمت عملی کے بارے میں ہے اور میں اس کے دو پہلوؤں پر کچھ گزارش کرنا چاہوں گا۔

ایک پہلو یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام، دینی قائدین اور مذہبی راہ نما علمی اور فکری طور پر اس مہم کو پوری سنجیدگی کے ساتھ ڈیل نہیں کر رہے ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں دینی حلقوں کے ارباب فکر و دانش کی درجنوں محافل میں شرکت کا موقع ملا ہے اور میں نے ان محافل میں شریک علمائے کرام، خطبا اور دینی کارکنوں کی کم وبیش پچانوے فیصد اکثریت کو اصل مسئلہ سے بے خبر پایا ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ حدود آرڈیننس کیا تھا؟ تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کیا ہے؟ کن مسائل میں تبدیلیاں ہوئی ہیں؟ اعتراضات کیا ہیں؟ پس منظر کیا ہے؟ مقاصد کیا ہیں؟ اور اس ایکٹ کی منظوری کے بعد ملک کے قانونی نظام اور معاشرتی ماحول میں کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی؟ اس سلسلہ میں بعض اہل علم نے سنجیدہ کام کیا ہے اور بہت سے مفید مضامین اور کتابچے سامنے لائے گئے ہیں مگر کسی کو پڑھنے کی فرصت نہیں ہے اور کسی کے نظام الاوقات میں مطالعہ، تحقیق اور غور وفکر کی گنجائش نہیں ہے۔

ملک کے تین چار بڑے شہروں سے دوستوں کے فون گزشتہ ہفتے کے دوران موصول ہوئے ہیں اور ہر جگہ کے احباب کا کہنا ہے کہ حقوق نسواں ایکٹ کے حوالہ سے ہمیں معلوم نہیں ہے کہ اصل مسئلہ کیا ہے اور تنازعہ کی نوعیت اور تفصیلات کیا ہیں۔ ایک شہر سے فون میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم شہر کے بڑے بڑے دینی اداروں میں گئے ہیں، ہمیں کہیں سے صحیح معلومات نہیں مل رہی ہیں اور صورت حال واضح نہیں ہو رہی ہے۔ ایک صاحب سے میں نے دریافت کیا کہ اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہ کا جامع مضمون کم وبیش تمام قومی اخبارات میں شائع ہوا ہے، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کے مضامین شائع ہوئے ہیں، میرے درجنوں مضامین روزنامہ 'اسلام' اور روزنامہ 'پاکستان' میں شائع ہو چکے ہیں اور دیگر بہت سے اصحاب قلم کی نگارشات قومی پریس کے ذریعہ مسلسل سامنے آ رہی ہیں، مگر معلوم ہوا کہ ہمارے علمائے کرام، خطبائے عظام، دینی راہ نماؤں، مدرسین، ائمہ مساجد حتیٰ کہ اس جدوجہد میں فرنٹ لائن کے لوگوں یعنی اسمبلیوں کے ممبر علمائے کرام کے پاس بھی ان مضامین پر ایک نظر ڈالنے کی فرصت نہیں ہے۔

ایک دوست نے بتایا کہ ٹی وی کے مختلف چینلز پر اس مسئلے پر جو مباحثے یا انٹرویو ہوئے ہیں، ان میں مولانا مفتی تقی عثمانی یا مولانا مفتی منیب الرحمٰن کے سوا کسی گفتگو میں ان سوالات کا جواب

موجود نہیں تھا جو تحفظ حقوق نسواں بل کے سلسلہ میں لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کر دیے گئے ہیں۔ ان صاحب کا کہنا تھا کہ دینی حلقوں کی نمائندگی کرنے والے حضرات کی گفتگو میں سطحیت، جذباتیت اور معروضی صورت حال سے بے خبری صاف صاف دکھائی دیتی ہے جو کسی پبلک جلسے میں تو چل جاتی ہے لیکن گفتگو کی میز پر، جہاں دوسری طرف سے استدلال اور معلومات کا کھلا استعمال ہو رہا ہو، اس طرز کی گفتگو اکثر اوقات فائدہ کی بجائے نقصان کا باعث بن جاتی ہے اور اس سے گفتگو کرنے والوں کی علمی تہی دامنی کا تاثر زیادہ اجاگر ہوتا ہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ دلائل موجود نہیں ہیں یا معلومات میسر نہیں ہیں یا ان تک رسائی کے مواقع مہیا نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ موجود ہے مگر ہمارے پاس فرصت نہیں ہے کہ ہم خود کو اس کے لیے محنت اور تگ و دو پر تیار نہیں کر پا رہے۔ اس ماحول میں اتنی بڑی جنگ لڑنا بہت مشکل کام ہے اور ہمیں بہر حال اپنے اس طرز عمل پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔

میری پریشانی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم اس جدوجہد کے دینی اور سیاسی ماحول کو گڈمڈ کرتے جا رہے ہیں جو بہت زیادہ نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔ آج کا ماحول اور اس کی پیچیدگیاں دیکھ کر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کے رفقا کی اس بصیرت پر میرا یقین اور زیادہ پختہ ہو گیا ہے جو انہوں نے قیام پاکستان کے بعد عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کی جدوجہد کو سیاسی کشمکش سے الگ تھلگ کر کے خالصتاً دینی اور علمی بنیادوں پر آگے بڑھانے کے لیے اختیار کی تھی اور بالآخر انہی لائنوں پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہتے ہوئے یہ جدوجہد کامیابی کی منزل سے ہمکنار ہو گئی تھی۔ مجھے جامعہ اشرفیہ لاہور میں ہونے والے اس فیصلہ سے بے حد خوشی ہوئی تھی کہ تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کی منظوری کے بعد ملک میں قرآن وسنت کے احکام وقوانین کی شکل بگاڑنے اور نافذ شدہ چند شرعی قوانین کو ختم کرنے کی جو سرکاری مہم پورے زور وشور کے ساتھ شروع کر دی گئی ہے، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کی طرز پر تمام مکاتب فکر کے دینی راہ نماؤں پر مشتمل ''مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان'' قائم کی جائے گی جو خالصتاً غیر سیاسی بنیادوں پر اس مقصد کے لیے رائے عامہ کو منظم کرے گی اور تمام دینی وسیاسی جماعتوں کے راہ نماؤں سے رابطہ کر کے اس جدوجہد کو صحیح معنوں میں قومی تحریک بنانے کی کوشش کرے گی۔ اس جدوجہد کا یہی فطری راستہ ہے

اور اسے اسی طریقہ سے موثر طور پر آگے بڑھایا جاسکتا ہے، مگر یہ بات مجبوراً لکھنا پڑ رہی ہے کہ دھیرے دھیرے اس جدوجہد کا یہ پہلو مجھے پس منظر میں جاتا ہوا دکھائی دے رہا ہے جو بہرحال پریشانی کی بات ہے۔ متحدہ مجلس عمل اپنے فورم سے اس مقصد کے لیے جو جدوجہد کر رہی ہے، وہ لائق تحسین ہے اور ہر دینی کارکن کو اس کی سپورٹ کرنی چاہیے۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی قیادت اس جدوجہد کو جس انداز سے تقویت پہنچا رہی ہے، وہ قابل داد ہے اور اس کا یہ کردار جاری رہنا چاہیے لیکن عوامی محاذ پر اس تحریک کی قیادت ''مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان'' ہی کو کرنی چاہیے اور اسے صرف ٹائٹل تک محدود رکھنے کی بجائے کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کی طرح کل جماعتی ''مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان'' کے نام سے منظم کیا جانا ضروری ہے۔ اس کا باقاعدہ ڈھانچہ تشکیل دیا جائے، اس کی قیادت میں تمام مکاتب فکر کو ذمہ دارانہ نمائندگی دی جائے اور اسے ایک مستقل فورم کی شکل دی جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ ملک کے عوام کو متحدہ مجلس عمل، مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے درمیان فرق واضح طور پر دکھائی دے، ورنہ بہت سی الجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا ہوں گی اور یہ پیچیدگیاں اس جدوجہد میں پیش رفت کی راہ میں رکاوٹ بھی بن سکتی ہیں۔

(روزنامہ اسلام، ۱۴ دسمبر ۲۰۰۶ء)

دینی جدوجہد کی حکمت عملی اور مجلس عمل

یہ بات حدود آرڈیننس کو سبوتاژ کرنے کی مہم کے ساتھ ہی سامنے آ گئی تھی کہ اس معاملے میں پیش رفت کے بعد تحفظ ناموس رسالت کے قانون اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے والی دستوری دفعات اور قانون کی باری ہے، کیونکہ امریکی وزارت خارجہ نے گزشتہ سال ستمبر کے دوران واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ حکومت پاکستان پر جن قوانین کے خاتمہ کے لیے دباؤ بڑھا رہے ہیں، ان میں حدود آرڈیننس کے ساتھ ساتھ تحفظ ناموس رسالت کا قانون اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی دستوری وقانونی دفعات بھی شامل ہیں چنانچہ اس کے بعد پاکستان کی حکمران مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل سید مشاہد حسین صاحب کی طرف سے مغرب کے لیے ایک یقین دہانی سامنے آئی جو انھوں نے پیرس میں ایک اجتماع سے خطاب کے دوران پیش کی کہ توہین رسالت پر موت کی سزا کے قانون میں ترامیم کی تیاری جاری ہے اور حکومت ترمیمی مسودہ قومی اسمبلی میں پیش کرنے کے لیے تیار ہے، البتہ اس سلسلے میں صرف اس قدر احتیاط سے کام لیا جا رہا ہے کہ اسے الیکشن کے بعد نئی اسمبلی میں پیش کیا جائے گا تاکہ الیکشن مہم میں اپوزیشن کے ہاتھ میں حکومت کے خلاف کوئی نیا ایشو نہ آ جائے۔

ہم اس حوالے سے ان کالموں میں یہ عرض کر چکے ہیں کہ جس طرح حدود آرڈیننس پر میڈیا میں ایک منظم بحث چھیڑ کر اسے متنازعہ بنایا گیا، حدود آرڈیننس کے خاتمہ یا اسے غیر موثر بنانے کے خواہش مند عناصر نے ''علم ودانش'' کے نام پر اس کے خلاف وہ طوفان بدتمیزی بپا کیا کہ شرعی حدود کے حوالے سے شکوک وشبہات کا پورے ملک میں بازار گرم ہو گیا جبکہ دوسری طرف حدود شرعیہ پر

سنجیدہ اور علمی گفتگو کرنے والے حلقے اس بحث میں الجھے رہے کہ الیکٹرانک میڈیا پر آنا اور شرعی ضروریات کے لیے الیکٹرانک میڈیا کا استعمال جائز بھی ہے یا نہیں اور جب وہ بالآخر میڈیا پر آئے بھی تو اس وقت جب چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں اور حدود شرعیہ کے خلاف مغرب نواز دانش وروں کا شور وغوغا اپنا کام دکھا چکا تھا۔

بالکل اسی طرز کی میڈیا وار اب تحفظ ناموس رسالت کے قانون کے حوالے سے شروع ہونے والی ہے اور ہمارے خیال میں اس بحث کے آغاز کا بہانہ ملکہ برطانیہ نے سلمان رشدی کو نائٹ ہڈ (سر) کا خطاب دے کر فراہم کر دیا ہے۔ جہاں تک سلمان رشدی کا تعلق ہے، ملکہ برطانیہ اور برطانوی حکومت سے یہ بات قطعی طور پر مخفی نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان اس شخص سے شدید نفرت رکھتے ہیں، اس لیے کہ اس نے اپنی بے ہودہ کتاب ''شیطانی آیات'' میں سرور دو عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں جو شرم ناک گستاخیاں کی ہیں، وہ دنیا کے کسی بھی مسلمان کے لیے قطعی طور پر ناقابل برداشت ہیں اور آج کے گئے گزرے دور میں بھی مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے، مگر قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی جان کا نذرانہ بخوشی دے دے گا لیکن ایسی کسی بے ہودگی کو کسی صورت میں برداشت نہیں کرے گا۔

سلمان رشدی کی تصنیف ''شیطانی آیات'' منظر عام پر آئی تو مسلمانان عالم اور خاص طور پر اسلامیان برطانیہ نے جس جوش وخروش کے ساتھ اپنے ایمانی جذبات اور حمیت وغیرت کا مظاہرہ کیا، وہ برطانوی حکومت اور ملکہ برطانیہ سے مخفی نہیں ہے اور گزشتہ سال ڈنمارک اور ناروے وغیرہ کے اخبارات میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخانہ کارٹون شائع ہونے پر عالم اسلام نے جس اجتماعی اور غیرت مندانہ ردعمل کا اظہار کیا، وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ اس کے بعد بھی اگر برطانوی حکومت یہ کہتی ہے کہ سلمان رشدی کو ''سر'' کا خطاب اس کی ادبی خدمات کے صلے میں دیا گیا ہے تو اسے مسلمانوں کے دینی جذبات پر طنز کی ایک نئی اور مکروہ صورت کے سوا اور کچھ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سلمان رشدی کو سر کا خطاب ملنے کے بعد پاکستان کے قومی میڈیا میں اس سلسلے میں بحث کا آغاز ہو گیا ہے اور جہاں قومی اور صوبائی اسمبلیوں اور دینی وسیاسی جماعتوں نے اس کے خلاف شدید ردعمل ظاہر کیا ہے، وہاں ایک اہم سیاسی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کے ذمہ دار راہ نما شاہ محمود قریشی نے یہ کہہ کر ناموس رسالت کے حوالے سے مسلمانوں کے دینی جذبات اور ان کے عقیدہ وایمان کے خلاف مورچہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''یہ برطانیہ کا داخلی معاملہ ہے۔'' اگرچہ برطانوی وزیر خارجہ نے سلمان رشدی کو سر کا خطاب دینے کے فیصلے پر قائم رہتے ہوئے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہونے پر ان سے معذرت کر کے پنجابی محاورہ کے مطابق ''گونگلواں توں مٹی جھاڑن'' (شلجم پر سے مٹی جھاڑنے) کی کوشش کی ہے، لیکن اس سے جس بحث کا آغاز ہو گیا ہے، وہ اب ہمارے خیال کے مطابق چلتی رہے گی اور اسی سے تحفظ ناموس رسالت کے قانون میں ان ترامیم کی راہ ہموار کی جائے گی جس کے لیے ایک عرصہ سے تیاری کی جا رہی ہے۔

اس کے ساتھ ایک اور خبر بھی شامل کر لیں جو روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ۱۸ر جون ۲۰۰۷ء کو شائع کی ہے کہ امریکہ کے بین الاقوامی مذہبی آزادی کمیشن نے پاکستان میں توہین مذہب سے متعلق قانون کے بے جا استعمال پر افسوس کرتے ہوئے اسلام آباد سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ملک میں اسلامی انتہا پسندی کا مقابلہ کرنے کے لیے سنجیدگی سے اقدامات کرے۔ کمیشن نے بش انتظامیہ سے بھی مطالبہ کیا ہے کہ وہ سنگین مذہبی تشویش ناک امور کے بارے میں اسلام آباد کے ساتھ سرگرمی کے ساتھ رجوع کرے۔ کمیشن نے پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ توہین مذہب کو غیر مجرمانہ قرار دے۔ گویا امریکہ کے بین الاقوامی مذہبی آزادی کمیشن کے نزدیک مذہب اور مذہبی شخصیات کی توہین سرے سے جرائم میں ہی شامل نہیں ہے اور اسے اس بات پر تکلیف ہے کہ جو بات ان کے نزدیک جرم ہی نہیں ہے، پاکستان نے اس کے لیے دفعہ ۲۹۵ کے تحت موت تک کی سزا مقرر کر رکھی ہے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ حدود آرڈیننس کے بارے میں بھی امریکہ اور مغرب کا موقف یہی تھا کہ ان قوانین کا بے جا استعمال ہو رہا ہے اور مغرب کا یہ موقف بھی ڈھکا چھپا نہیں ہے کہ رضامندی کا زنا

سرے سے جرم نہیں ہے، چنانچہ اسی پس منظر میں حدود قوانین کے غلط استعمال کے پراپیگنڈا سے بات شروع ہوئی اور اس سے نام نہاد تحفظ حقوق نسواں ایکٹ'' کی صورت میں جو نتائج حاصل کیے گئے، وہ سب کے سامنے ہیں اور اب یہی کھیل تحفظ ناموس رسالت کے قانون کے ساتھ کھیلا جانے والا ہے۔

دوسری طرف ہماری صورت حال یہ ہے کہ حدود آرڈیننس کے تحفظ میں واضح ناکامی کے بعد بھی ہم اسی پرانی ڈگر پر قائم ہیں اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ ہمارے نزدیک حدود آرڈیننس کے حوالے سے دینی حلقوں کی پسپائی کے دو واضح اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے ''میڈیا وار'' کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور اس معرکہ میں صرف ''منبر و محراب'' پر قناعت کر لی۔ ہم اس فرق کو محسوس نہیں کر سکے کہ منبر و محراب کے ماحول میں کی جانے والی بات صرف ان لوگوں تک پہنچتی ہے جو خود وہاں تک چل کر آتے ہیں اور مجموعی آبادی میں ان کا تناسب معلوم کرنا مشکل نہیں ہے، جبکہ الیکٹرانک میڈیا کی رسائی کم و بیش ہر پاکستانی کے ''بیڈ روم'' تک ہے۔ ہم نے یہ جنگ، جو دراصل ''میڈیا وار'' تھی، کلاشنکوف کے مقابلے میں تلوار کے ساتھ لڑنے کی کوشش کی ہے جس کا نتیجہ یہی ہونا تھا جو ہمارے سامنے ہے۔

دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ ہم اس جدوجہد کے لیے ''کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت'' کی طرز کا کوئی ایسا دینی محاذ قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے جو اقتدار اور اپوزیشن کی سیاست سے الگ تھلگ رہتے ہوئے ایک دینی اور ملی مسئلے کے طور پر قوم کے اجتماعی جذبات کی ترجمانی اور اس کی قیادت کر سکے۔ ہماری معلومات کے مطابق ایک الگ دینی محاذ کی تشکیل میں متحدہ مجلس عمل کے تحفظات آڑے آئے، لیکن متحدہ مجلس عمل کی قیادت نہ خود اس مسئلے کو صحیح طور پر ڈیل کر سکی اور نہ ہی اس نے اس کے لیے الگ دینی محاذ کے قیام کا راستہ دیا اور ایم ایم اے کے تحفظات کی دھند میں حدود آرڈیننس کا تیا پانچہ ہو گیا۔

ہمارے نزدیک ''لال مسجد'' کا قضیہ بھی اسی صورت حال کا ردعمل ہے۔ لال مسجد کے طریق کار سے ہمیں بھی اختلاف ہے اور ہم ان کالموں میں عرض کر چکے ہیں کہ جو کچھ لال مسجد کر رہی ہے،

بروقت مشاورت کی صورت میں وہ سب کچھ اس سے کہیں بہتر صورت میں کیا جا سکتا تھا۔ ہم نے لال مسجد کے طریق کار کو کھلے بندوں غیر دانش مندانہ اور دینی جدوجہد کے لیے نقصان دہ قرار دیا ہے اور سمجھتے ہیں، لیکن یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ بھی دراصل اسی طرز عمل کا نتیجہ اور ردعمل ہے کہ ہماری دینی سیاسی قیادت خالصتاً دینی معاملات میں نہ خود دینی حلقوں کے جذبات اور دینی جدوجہد کے تقاضوں کی صحیح طور پر نمائندگی اور ترجمانی کر پاتی ہے اور نہ ہی ان تقاضوں اور جذبات کے الگ طور پر اظہار کی کوئی الگ صورت اس کے لیے قابل قبول ہوتی ہے جو ہماری ماضی کی روایات کے بھی خلاف ہے، اس لیے کہ حضرت مولانا مفتی محمود نے ہمیشہ ایسے دینی محاذوں کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی فرمائی ہے۔

ہمارے نزدیک سلمان رشدی کو سر کا خطاب دینے کی بات بھی بہت اہم ہے اور مسلمانوں کے دینی جذبات کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن امریکہ کے مذہبی آزادی کمیشن کی طرف سے مذہب اور مذہبی شخصیات کی توہین کو جرائم کی فہرست سے نکال دینے کی ''وارننگ'' اس سے کہیں زیادہ سنگینی کی حامل ہے اور اگر اب بھی ہم اپنی حکمت عملی اور ترجیحات پر نظر ثانی کے لیے تیار نہیں ہیں تو خاکم بدہن اس محاذ پر بھی پسپائی کے سوا کچھ حاصل ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، آمین ثم آمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور)

جامعہ حفصہ کا سانحہ: دینی سیاسی جماعتوں کی ذمہ داری

جامعہ حفصہ اور لال مسجد اسلام آباد کے خلاف سرکاری فورسز کے مسلح آپریشن نے پورے ملک کو دہلا کر رکھ دیا ہے۔ ایک عرصہ سے مختلف حلقوں کی طرف سے یہ کوشش جاری تھی کہ کسی طرح یہ تصادم رک جائے اور خونریزی کا وہ الم ناک منظر قوم کو نہ دیکھنا پڑے جس نے ملک کے ہر فرد کو رنج و صدمہ کی تصویر بنا دیا ہے، لیکن جو ہونا تھا وہ ہوا، بہت برا ہوا اور بہت برے طریقے سے ہوا۔ اس سے کچھ لوگوں کو ضرور تسکین حاصل ہوئی ہوگی جو حکومت کی رٹ بحال کرنے کے ساتھ ساتھ دہشت اور رعب و دبدبہ مسلط کرنا بھی ضروری سمجھ بیٹھے تھے اور ان کا خیال تھا کہ طاقت اور اسلحہ کا بے دریغ استعمال کیے بغیر اور آگ اور خون کا کھیل کھیلے بغیر شاید حکومت کی رٹ کا وقار قائم نہیں رہے گا۔ چند افراد ضرور ایسے ہوں گے، لیکن بحیثیت مجموعی پوری قوم غم زدہ ہے، افسردہ ہے، مضطرب اور بے چین ہے کہ بہت سے بے گناہوں کے لاشے تڑپے ہیں، بچوں اور عورتوں کا خون بہا ہے اور یہ سب کچھ اللہ کے گھر میں ہوا ہے اور ایک دینی درس گاہ میں ہوا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایک سرکاری چلڈرن لائبریری پر جامعہ حفصہ کی طالبات کے قبضہ کے ساتھ جب اس تنازع کا آغاز ہوا تھا اور اس کے بعد ایک مبینہ قحبہ خانہ اور پھر مساج پارلر کے خلاف کارروائی نے اس معاملہ کو آگے بڑھایا تھا تو ہم نے اسی وقت یہ عرض کر دیا تھا کہ ایک مسلمان ملک کے اندر حکومت وقت کے خلاف اس قسم کے تصادم کے ماحول اور قانون کو ہاتھ میں لینے کی حمایت نہیں کی جا سکتی اور مقاصد کتنے ہی نیک اور اچھے کیوں نہ ہوں، ان کے لیے اس طرز کی جدوجہد کو سند جواز فراہم نہیں کی

جاسکتی۔اس پر ملک بھر کے جمہور علمائے کرام کا کم وبیش اجماع منعقد ہو گیا تھا،مگر اس کی پروا کیے بغیر معاملات کو اسی رخ پر آگے بڑھانے کا سلسلہ جاری رہا۔

دوسری طرف ملک کی سنجیدہ دینی قیادت نے حکومت پر مسلسل زور دیا کہ وہ طاقت کے استعمال سے گریز کرے، جائز مطالبات منظور کرنے کی طرف توجہ دے، ان اسباب وعوامل کو دور کرنے کی کوشش کرے جن کے ردعمل میں شدت کی یہ صورت سامنے آئی ہے اور مذاکرات کے ذریعے سے مسئلے کو حل کرنے کا راستہ نکالے،لیکن حکومت نے بھی اس کے لیے سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا اور اس کی غیر سنجیدگی کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے ان جائز مطالبات میں سے کسی ایک کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھا جن کی بنیاد پر لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ شدت کی اس انتہا تک جا پہنچی تھی۔

ہمیں اس بات سے اتفاق ہے کہ اگر حکومت اسلامی نظام کے نفاذ، اسلام آباد میں گرائی جانے والی مساجد کو دوبارہ تعمیر کرنے، حدود شرعیہ میں کی گئی ترامیم پر نظر ثانی اور فحاشی کے مبینہ مراکز کو بند کرنے میں سے کسی ایک مسئلے کی طرف بھی سنجیدگی سے متوجہ ہو جاتی تو اس سلسلے میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ کے رویے میں پائی جانے والی شدت کو کم کیا جاسکتا تھا اور ہم لال مسجد کے خطیب مولانا عبدالعزیز کی اس بات سے بھی متفق ہیں جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ہمارے طریق کار سے اختلاف کرنے والے ان جائز مطالبات کے لیے صحیح طریق کار سے جدوجہد کیوں نہیں کرتے؟ مولانا عبدالعزیز اور غازی عبدالرشید شہید کے طریق کار سے ہم نے بھی اختلاف کیا تھا اور اب بھی ہم اسے غلط ہی سمجھتے ہیں کہ ایک مسلمان ملک میں حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانا، قانون کو ہاتھ میں لینا اور مسلح تصادم کا ماحول پیدا کرنا ہمارے نزدیک شرعاً اور اخلاقاً کسی بھی لحاظ سے درست نہیں ہے،لیکن مولانا عبدالعزیز کے اس سوال کا آخر کیا جواب ہے کہ ان کے طریق کار سے اختلاف کرنے والوں نے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ اور فحاشی ومنکرات کے سدباب کے لیے صحیح طریق کار پر مبنی کون سی جدوجہد کا اہتمام کیا ہے؟ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ معاملات کو اس رخ تک پہنچانے میں جہاں اسلامی نظام کے معاملے میں حکومت کی سرد مہری کارفرما ہے، وہاں اسلامی

نظام کے لیے جدوجہد کی داعی دینی سیاسی جماعتیں بھی اس کی ذمہ دار ہیں کہ ان کی بے عملی اور تغافل نے وہ خوف ناک خلا پیدا کر دیا ہے جس کو پر کرنے کے لیے تشدد اور بغاوت کی تحریکات آگے بڑھ رہی ہیں اور یہ قانون فطرت ہے کہ خلا جس قدر گہرا ہو، اس کی جگہ لینے والی قوتیں اسی قدر شدت اور تیزی کے ساتھ لپکتی ہیں اور بسا اوقات آندھی اور طوفان کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہیں۔

جہاد افغانستان کے بعد یہ بات حکومت اور دینی سیاسی جماعتوں، دونوں سے توجہ کی طالب تھی کہ جن ہزاروں افراد نے پاکستان سے جا کر افغانستان میں روسی استعمار کے خلاف عملی جنگ لڑی ہے، وہ صرف اسلحہ چلانے کا ہی عملی تجربہ نہیں رکھتے بلکہ اسلام کی بالادستی اور نفاذ اسلام کے مخلصانہ جذبے سے بھی سرشار ہیں۔ ان کی تعداد سینکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہے اور وہ ملک کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ انھیں ملک وقوم کا قیمتی اثاثہ سمجھتے ہوئے نہ حکومت نے ان کے جذبات و رجحانات کو اسلام اور پاکستان کے لیے مثبت رخ پر قائم رکھنے کی کوئی پالیسی اپنائی اور نہ ہی دینی سیاسی جماعتوں نے انھیں اپنانے اور اپنی جدوجہد میں شریک کرنے کی طرف توجہ دی بلکہ انھیں اپنا حریف اور اپنے لیے خطرہ تصور کیا گیا اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کے لیے جو نیا ماحول کھڑا کیا گیا، وہ ان کی کردار کشی، توہین، طنز واستہزا، اور تحقیر وحوصلہ شکنی سے عبارت تھا۔ پھر اس فضا میں ان کے سامنے افغانستان میں امریکی فوجیں اتریں، طالبان کی حکومت کو قوت کے ساتھ تہس نہس کر دیا گیا اور پاکستان میں دینی شعائر اور اسلامی روایات واقدار کو پامال کرنے کی پالیسیاں آگے بڑھنے لگیں تو ان کا غصہ اور نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گئے اور وہی غصہ ونفرت مجتمع ہو کر لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں حکمرانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

ہم نے حکومت وقت کے ساتھ مولانا عبدالعزیز اور غازی عبدالرشید کے تصادم اور محاذ آرائی کے طرز عمل کو غلط قرار دیا ہے اور فی الواقع اسے غلط سمجھتے ہیں اور ہمیں اس بات کا بھی شدید دکھ ہے کہ ان بھائیوں نے حکومت کے ساتھ ساتھ خود اپنی دینی وعلمی قیادت سے بھی بغاوت کی اور ان کی مشاورت وہدایات کو قبول نہ کیا، لیکن اس کا یہ پس منظر بھی ہمارے سامنے ہے کہ اسلامی نظام اور دینی شعائر واقدار کے بارے میں حکومتی حلقوں اور اداروں کی منافقانہ پالیسی کا آخری جذباتی ردعمل یہی

ہوسکتا تھا اور غازی برادران کے دل میں یہ بات یقین کے درجے میں بیٹھ چکی تھی کہ دینی سیاسی جماعتوں نے اپنے لیے معروضی سیاست اور اقتدار کی اکھاڑ پچھاڑ کو ہی آخری منزل سمجھ لیا ہے اور ان سے نفاذ اسلام کے لیے کسی موثر جدوجہد کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

ہمارے نزدیک یہ دو عوامل ہیں جنھوں نے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کو حکومت کے خلاف ایک مسلح مورچہ بنا دیا اور بات لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف سرکاری آپریشن پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد ملک بھر میں ہونے والے ہنگاموں اور خودکش حملوں نے لال مسجد کی اس بغاوت کا دائرہ دور دور تک وسیع کر دیا ہے۔ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کر لیجیے کہ ۱۴ر جولائی کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ سرگودھا میں ایک نوجوان نے بینک ڈکیتی کے دوران میں زخمی حالت میں گرفتار ہونے کے بعد یہ بتایا ہے کہ اس نے بینک پر ڈاکہ اس لیے ڈالا ہے تاکہ رقم حاصل کر کے لال مسجد کا بدلہ لینے اور ملک میں نفاذ شریعت کی جدوجہد منظم کرنے کے لیے کام کر سکے، یعنی اس نے ملک میں نفاذ شریعت کی جدوجہد کے لیے بینک ڈکیتی کا راستہ اختیار کیا ہے۔ یہ ایک المیہ ہے، بہت بڑا المیہ ہے اور اس قسم کے المیے مایوسیوں سے جنم لیا کرتے ہیں۔ جب لوگوں کو ان کے جائز مطالبات اور جذبات کا صحیح جگہ سے جواب نہیں ملتا تو وہ اس کی تسکین کے لیے متبادل ذرائع اختیار کرتے ہیں اور یہ متبادل ذرائع ضروری نہیں کہ صحیح بھی ہوں۔

پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے جس کا وجود اسلام کی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور اس کے دستور میں اسلامی نظام کی عمل داری اور اسلامی معاشرے کے قیام کی ضمانت دی گئی تھی۔ جب ایک مسلم نوجوان اس سلسلے میں حکومت کی سرد مہری اور حکومتی اداروں کا منفی طرز عمل دیکھتا ہے تو اس کی نگاہیں بے ساختہ دینی جماعتوں کی طرف اٹھتی ہیں کہ وہ کیا کر رہی ہیں اور حکومتی طرز عمل کا رخ تبدیل کرانے کے لیے کس سنجیدگی کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ اگر اسے دینی سیاسی جماعتوں کی جدوجہد اور تحریک میں اپنے جذبات کی تسکین کا سامان مل جائے تو وہ وہاں رک جائے گا اور خود کو ان کے حوالے کر دے گا، لیکن اگر اسے وہاں بھی امید کا کوئی پہلو دکھائی نہ دے اور ہر طرف وقتی مفادات اور مصلحتوں کا ہی ماحول ملے تو پھر اس کے لیے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ خاموش ہو کر بیٹھ

جائے اور اسلام کی بالادستی اور فحاشی و بے حیائی سے معاشرہ کو پاک کرنے کا خیال اپنے ذہن سے نکال دے اور یا پھر اس کے لیے اپنا راستہ خود نکالے اور جو کچھ وہ اس کے لیے کر سکتا ہے، اس کی منصوبہ بندی کرے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے ہزاروں نوجوان جو نفاذ اسلام کے مخلصانہ جذبہ سے بہرہ ور ہیں اور اسلحہ کی ٹریننگ بھی رکھتے ہیں، گزشتہ ایک عشرے کے دوران میں اسی تجربے سے گزرے ہیں اور اب وہ اس تجربے کے آخری مرحلے میں ہیں جس کی ایک جھلک لال مسجد میں پوری قوم نے دیکھ لی ہے اور اگر حکومت اور دینی جماعتوں نے اب بھی اس مسئلے کو سنجیدگی کے ساتھ نہ لیا اور ان مخلص اور پرجوش نوجوانوں کے جذبات کو مثبت رخ دینے کی کوئی معقول کوشش نہ کی تو لال مسجد اس قضیہ کی انتہا نہیں ہوگی بلکہ خدانخواستہ ابتدا ثابت ہو سکتی ہے۔

لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے تنازع میں اپنی جانوں کا نذرانہ دینے والے شہدا کے لیے ہم دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت انھیں جوار رحمت میں جگہ دیں۔ ہمیں سرکاری فورسز کے ان نوجوانوں سے بھی گہری ہمدردی ہے جنھوں نے اپنی جانیں پیش کیں۔ وہ ڈیوٹی پر تھے اور فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت تمام شہدا کو جوار رحمت میں جگہ دیں، زخمیوں کو صحت عطا فرمائیں، پس ماندگان کو صبر جمیل سے نوازیں اور ہم سب کو بحیثیت قوم اس سانحہ سے سبق حاصل کرتے ہوئے اپنی غلطیوں کی اصلاح کے ساتھ ملک و قوم کے مستقبل کی بہتر صورت گری کی توفیق دیں۔ آمین یارب العالمین۔

(۱۷ر جولائی ۲۰۰۷ء)

عام انتخابات اور متحدہ مجلس عمل کا مستقبل

ملک میں عام انتخابات کی آمد آمد ہے اور بڑی بڑی سیاسی پارٹیاں لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں اتر چکی ہیں۔ قاضی حسین احمد، عمران خان اور محمود خان اچکزئی کی جماعتوں کے ساتھ ساتھ وکلا کی نمائندہ تنظیموں نے انتخابات کا بائیکاٹ کر رکھا ہے جبکہ ان کے علاوہ کم وبیش تمام سیاسی و دینی جماعتیں الیکشن کے عمل میں شریک ہیں اور دن بدن انتخابی مہم میں تیزی آ رہی ہے۔ ۸ر جنوری ۲۰۰۸ء کو ہونے والے ان انتخابات پر دنیا بھر کی نظریں لگی ہوئی ہیں اور مختلف ممالک اور عالمی اداروں کی طرف سے ان کے نمائندے الیکشن کے عمل کا جائزہ لینے کے لیے پاکستان آنے والے ہیں۔

الیکشن کا بائیکاٹ کرنے والوں کا موقف یہ ہے کہ ایمرجنسی اور پی سی او کے ذریعے عدالت عظمیٰ کے چیف جسٹس اور اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کو ان کے مناصب سے الگ کر کے ملک کے عدالتی نظام کو مفلوج کر دیا گیا ہے اور آئین میں شخصی طور پر کی گئی ترامیم کے ساتھ آئین کو مسخ کیا جا چکا ہے، اس لیے ان انتخابات میں حصہ لینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ ان کا بائیکاٹ کر کے ایک ایسی تحریک برپا کرنا ضروری ہو گیا ہے جو آئین کی سابقہ پوزیشن کی بحالی اور چیف جسٹس اور ان کے ساتھ پی سی او کے تحت حلف نہ اٹھانے والے تمام ججوں کی ان کے دستوری مناصب پر واپسی پر منتج ہو کیونکہ اس کے بغیر عوام کی حقیقی نمائندہ حکومت کا قیام ممکن نہیں ہے، جبکہ انتخابات میں حصہ لینے والوں میں سے اکثر کا موقف یہ ہے کہ موجودہ حالات میں اس الیکشن میں حصہ لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کیونکہ سیاسی عمل سے الگ رہ کر آئین کی بحالی، ججوں کی واپسی اور جمہوری عمل کی بالادستی کے لیے موثر

جدوجہد نہیں کی جاسکتی، اس لیے وہ بادل نخواستہ اس عمل میں شریک ہو رہے ہیں تاکہ عوام کی حمایت کے ساتھ اسمبلیوں میں پہنچ کر وہ ملک کا دستوری قبلہ درست کرنے کے لیے کردار ادا کر سکیں۔

دونوں موقف اپنے اندر وزن رکھتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے حق میں دلائل پیش کیے جاسکتے ہیں، لیکن یہ بات ۸/جنوری کے انتخابات میں ڈالے جانے والے ووٹوں کے تناسب سے معلوم ہوگی کہ ملک کے عوام نے ان میں سے کس موقف کو ترجیح دی ہے اور ملک کے آئندہ سیاسی نقشے کے خدوخال بھی اس کے بعد ہی صحیح طور پر واضح ہوں گے، البتہ ان انتخابات کے تناظر میں ایک بات جو ہمارے لیے باعث تشویش بنی ہے، وہ متحدہ مجلس عمل کا انتشار وخلفشار ہے کہ قومی سیاست میں دینی حلقوں کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعتوں کا طویل مدت کے بعد ایک ایسا مشترکہ محاذ سامنے آیا تھا جس نے عام ووٹروں کی توجہ حاصل کی تھی اور اس کے نتیجے میں قومی اسمبلی اور سینٹ میں دینی سیاست کی معقول نمائندگی کے علاوہ صوبہ سرحد کی مکمل حکومت اور بلوچستان کی مخلوط حکومت میں شرکت دینی راہ نماؤں کے حصے میں آئی تھی اور یہ توقع پیدا ہونے لگی تھی کہ اگر متحدہ مجلس عمل اپنی اس پوزیشن کو مزید پیش رفت کے لیے موثر طور پر کام میں لے آئی تو وہ قومی سیاست میں مزید آگے بڑھنے اور نفاذ اسلام کے لیے زیادہ موثر جدوجہد کے مواقع حاصل کر لے گی، لیکن ایسا نہ ہو سکا اور اس کی پالیسی ترجیحات میں معروضی سیاست اور وقتی ضروریات کی بالادستی نے اس کے بارے میں عام حلقوں بالخصوص دینی عناصر کی توقعات اور امیدوں کو بریک لگا دی۔ بادی النظر میں قبائلی علاقوں میں دینی مدارس اور مجاہدین کے خلاف امریکی آپریشن، حدود آرڈیننس میں کی جانے والی خلاف شریعت ترامیم اور جامعہ حفصہ اور لال مسجد کے سانحہ کے بارے میں متحدہ مجلس عمل کی مصلحت آمیز روش اور صوبہ سرحد میں نفاذ اسلام کے حوالے سے کوئی نظر آنے والی پیش رفت نہ کر سکنے کی صورت حال نے دینی جماعتوں کے اس متحدہ محاذ کے بارے میں دینی حلقوں میں مایوسی کو جنم دیا ہے جبکہ سیاسی حلقوں میں سترھویں آئینی ترمیم کی منظوری میں متحدہ مجلس عمل کا کردار اور جنرل (ر) پرویز مشرف کے دوبارہ صدر منتخب ہونے کے موقع پر اسمبلیوں سے مستعفی ہونے کے سوال پر اس کا طرز عمل اس کے اعتماد کو مجروح کرنے کا باعث بنا، لیکن اس سب کچھ کے باوجود اگر متحدہ مجلس عمل اپنا اتحاد

برقرار رکھتی اور ۸ر جنوری کے انتخابات کے حوالے سے کوئی متفقہ فیصلہ کر لینے میں کامیاب ہو جاتی تو گزشتہ غلطیوں یا غلط فہمیوں کی تلافی کے امکانات موجود تھے، لیکن افسوس کہ یہ بھی نہ ہو سکا اور ہمارے نزدیک اس معاملے کا سب سے زیادہ تشویش ناک پہلو یہی ہے۔

ہماری دینی جماعتوں بلکہ زیادہ واضح الفاظ میں مسلکی حلقوں نے قومی سیاست میں نفاذ اسلام کے نعرے کے ساتھ اپنے الگ اور الگ الگ تشخص کے اظہار کو ضروری سمجھتے ہوئے ایک اسلامی معاشرہ اور ریاست کی تشکیل کے قومی مقصد کو ایک حد تک کارنر تو کر ہی لیا تھا جس کے مالہ و ماعلیہ پر گفتگو ایک مستقل بحث کی متقاضی ہے لیکن اگر وہ اس کے منطقی اور ناگزیر تقاضوں کا ادراک کرتے ہوئے ان کی تکمیل کا ہی اہتمام کر پائیں تو بھی اس حوالے سے توقعات اور امیدوں کا تسلسل قائم رہنے کی صورت دکھائی دے رہی تھی مگر متحدہ مجلس عمل کے پانچ سالہ سیاسی کردار کے پس منظر میں نفاذ اسلام کے حوالے سے عوام کی امیدیں ایک سوالیہ نشان کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہیں۔

متحدہ مجلس عمل کا مشترکہ محاذ ابھی رسمی طور پر قائم ہے اور اس کے دائرۂ کار کو کسی حد تک محدود کرتے ہوئے اسے غیر سیاسی طور پر باقی رکھنے کی باتیں بھی بعض ذمہ دار حلقوں کی طرف سے کی جا رہی ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ سب دل کو بہلانے کی باتیں ہیں، اس لیے کہ متحدہ مجلس عمل کا اصل مقصد وجود قومی سیاست میں دینی حلقوں کی مشترکہ نمائندگی، نفاذ اسلام کے لیے متحدہ سیاسی کردار اور اسلامائزیشن کے عمل میں رائے عامہ کی متفقہ راہ نمائی ہے۔ اگر اس میں بھی متحدہ مجلس عمل کے قائدین کے راستے الگ الگ ہو رہے ہیں تو کسی اور بہانے سے خود کو قوم کے سامنے ''متحدہ'' شو کرنے کے تکلف کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟

ہماری خواہش اور دعا ہے کہ متحدہ مجلس عمل اپنے حقیقی مقاصد کے لیے قائم رہے، خاص طور پر جمعیۃ علمائے اسلام اور جماعت اسلامی کی قیادتیں اپنی معروضی اور جماعتی ضروریات و مفادات پر اجتماعی تقاضوں اور ملی مقاصد کو ترجیح دیتے ہوئے ایثار و قربانی سے کام لیں اور نفاذ اسلام کے حوالے سے عوامی امیدوں کی اس (خاکم بدہن) آخری شمع کو گل ہونے سے بچا لیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، جنوری ۲۰۰۸ء)

معروضی سیاست، عام انتخابات اور مجلس عمل

میں نے ۱۹۹۰ء کے بعد سے جمعیۃ علمائے اسلام کا باقاعدہ اور مسلسل رکن ہونے کے باوجود انتخابی سیاست سے لاتعلقی اختیار کر رکھی ہے اور اس سلسلے میں میرا ایک مستقل موقف ہے کہ ہمارے جماعتی حلقوں میں نہ تو نظریاتی سیاست اور معروضی سیاست کے درمیان ایسا توازن باقی رہا ہے کہ ہم خود کو شرح صدر کے ساتھ نظریاتی سیاست کا نمائندہ قرار دے سکیں اور نہ ہی انتخابی سیاست کے وہ ناگزیر تقاضے پورے کرنے کی طرف ہماری سنجیدہ توجہ ہے جن کے بغیر انتخابی سیاست سے دینی وملی مقاصد کے لیے فوائد کا حصول ممکن ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاتھوں میں پرچم نظریاتی سیاست کا ہے مگر ہماری شب وروز کی تمام تر سرگرمیاں معروضی سیاست کی بھول بھلیوں میں گردش کر رہی ہیں۔ ان کے درمیان توازن اور جوڑ کی کوئی ڈور اب ہمارے ہاتھوں میں نہیں ہے اور ملک میں نفاذ شریعت کے خواہاں حلقوں میں اس حوالے سے سیاسی عمل اور انتخابی سیاست سے مایوسی اور بددلی میں جو مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور اس کے نتیجے میں تشدد کا ذہن ہر سطح پر فروغ پاتا جا رہا ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم لوگ جو سیاسی عمل اور انتخابی سیاست کے ذریعے نفاذ اسلام کے لیے جدوجہد کرتے آ رہے ہیں اور ۱۹۹۰ء تک ہم نے اس میں مسلسل پیش رفت کی ہے، اب اس میدان میں اپنی جدوجہد اور طرز عمل کے بارے میں دینی کارکنوں کا اعتماد بحال رکھنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے اور یہ ذہن دن بدن تقویت پکڑتا جا رہا ہے کہ سیاسی عمل کے ذریعے نفاذ اسلام کا کوئی امکان باقی نہیں رہا، اس لیے اب ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے متبادل راستے اختیار کرنے کی

ضرورت ہے۔

یہ ذہن صحیح ہے یا غلط اور اس ذہن کی پیش قدمی کے نتائج کا موجودہ حالات میں یہ ملک متحمل ہو سکے گا یا نہیں؟ یہ ایک مستقل مسئلہ ہے جو تفصیلی بحث کا متقاضی ہے اور ہم کسی موقع پر ان شاء اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں اپنی معروضات تفصیل کے ساتھ پیش کریں گے، مگر اس وقت ہم اس کے صرف اس پہلو پر عرض کر رہے ہیں کہ یہ ذہن پیدا ہونے اور اس کے تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ ہے کہ سیاسی عمل کے ذریعے نفاذ اسلام کی جدوجہد کرنے والے حلقے اپنی پالیسیوں اور طرز عمل کے حوالے سے دینی کارکنوں کا اعتماد کھو رہے ہیں اور مستقبل کی قومی سیاست اور دینی سیاست میں اس کے انتہائی دوررس نتائج ہوں گے۔

متحدہ مجلس عمل اس سلسلے میں امید کی آخری کرن تھی اور گزشتہ انتخابات میں اس کی پیش رفت نے یہ امید پھر سے پیدا کر دی تھی کہ قومی سیاست میں متحرک دینی جماعتیں ایک بار پھر نفاذ اسلام کی طرف پیش قدمی کی صلاحیت حاصل کر لیں گی، لیکن موجودہ انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کے باہمی خلفشار نے اس امید کو شکوک وشبہات کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ ہمارے ''مہربانوں'' نے ہمیں رفتہ رفتہ اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ دینی جماعتوں کا متحدہ محاذ اپنے وجود کے بارے میں ہی سوالیہ نشان بن کر رہ گیا ہے۔ الیکشن کا بائیکاٹ کرنے والے بڑے خلوص کے ساتھ مطمئن ہیں کہ وہ بالکل صحیح رخ پر ہیں اور الیکشن لڑنے والے اس سے زیادہ خلوص کے ساتھ تسلی رکھتے ہیں کہ ان کا سیاسی قبلہ بالکل درست ہے جبکہ

صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

الیکشن کی صورت حال سب کے سامنے ہے۔ صوبہ سرحد میں، جہاں ایم ایم اے نے پانچ سال حکومت کی ہے، اس کی دونوں اہم پارٹیاں جمعیۃ علمائے اسلام اور جماعت اسلامی ایک دوسرے کی طرف پشت کیے کھڑی ہیں اور بلوچستان میں، جہاں جمعیۃ علمائے اسلام ہی ایم ایم اے کی سب سے بڑی بلکہ واحد سیاسی قوت تھی، خود اسی کے دو حصے کر کے انھیں ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا کر دیا گیا ہے۔ ان حالات میں انتخابی نتائج کے بارے میں کسی خوش فہمی کا آخر کیسے اظہار

کیا جا سکتا ہے؟ اس لیے ہمیں الیکشن اور اس کے نتائج سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہماری دلچسپی کا صرف ایک پہلو اس میں باقی رہ گیا ہے کہ متحدہ مجلس عمل کو توڑ دینے سے اب تک گریز کیا گیا ہے اور اس کے مستقبل کا فیصلہ الیکشن کے بعد کے حالات پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اگر اس الیکشن کے بعد متحدہ مجلس عمل اپنا وجود باقی رکھنے اور ترجیحات کا دائرہ درست کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو مستقبل میں دینی سیاست کے کسی حد تک بہتر مستقبل کی توقع کی جا سکتی ہے، ورنہ دینی جدوجہد کی قیادت اب ''منشور'' کی بجائے ''کلاشنکوف'' کی طرف منتقل ہوتی نظر آ رہی ہے۔ پھر ہر چہ باداباد۔

(۱۶ر فروری ۲۰۰۸ء)

عام انتخابات کے نتائج اور متحدہ مجلس عمل کا مستقبل

۱۸ر فروری کو ہونے والے عام انتخابات کے نتائج ملک بھر میں زیر بحث ہیں اور ان کے حوالے سے ملک کے مستقبل کے بارے میں قیاس آرائیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ نتائج خلاف توقع نہیں ہیں۔ ملک کے سیاسی حالات جس رخ پر آگے بڑھ رہے تھے، ان سے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا کہ الیکشن میں ووٹروں کا ٹرن آؤٹ کم رہے گا، پیپلز پارٹی سیٹوں کے حصول میں سب سے آگے رہے گی اور مسلم لیگ ق کے ساتھ ساتھ متحدہ مجلس عمل کو بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بہر حال اب قومی سیاست کی نئی صف بندی ہو چکی ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان مسلم لیگ (ن)، پاکستان مسلم لیگ (ق)، متحدہ قومی موومنٹ اور نیشنل عوامی پارٹی اس پوزیشن میں آ گئی ہیں کہ وہ مرکز اور صوبوں میں حکومت سازی کے لیے کسی نہ کسی درجے میں کوئی کردار ادا کر سکیں اور اس کے لیے مختلف سطحوں پر جوڑ توڑ کا سلسلہ جاری ہے۔

الیکشن کے نتائج سے ظاہر ہے کہ جتنے لوگوں نے بھی ووٹ ڈالے ہیں، ان کی غالب اکثریت نے سابقہ حکومت کی پالیسیوں کو مسترد کر دیا ہے اور ملک کی رائے عامہ کی یہ خواہش نمایاں نظر آ رہی ہے کہ الیکشن کے بعد صرف حکومت ہی تبدیل نہ ہو، بلکہ قومی پالیسیوں میں بھی واضح تبدیلی نظر آئے، لیکن صدر پرویز مشرف مسلسل اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ حکومت بے شک الیکشن کے نتائج کی روشنی میں نئی بن جائے، لیکن ان کی پالیسیوں کا تسلسل اسی طرح جاری رہے اور عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والی نئی حکومت عوامی رجحانات کو اپنی پالیسیوں کی بنیاد بنانے کی بجائے صدر

پرویز مشرف کی پالیسیوں کو بدستور قائم رکھے، جبکہ اس مقصد کے لیے انھیں امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی سفارتی سرگرمیوں کی حمایت حاصل ہے۔ دوسری طرف سابقہ حکمران پارٹی کے ذمہ دار راہ نماؤں کا کہنا ہے کہ ان کی شکست کے اسباب میں (۱) امریکہ نواز پالیسی، (۲) قبائلی علاقوں میں فوج کشی، (۳) لال مسجد کے خلاف وحشیانہ آپریشن (۴) مہنگائی میں ہوش ربا اضافے اور (۵) عدلیہ کی بالادستی کے خلاف کیے جانے والے اقدامات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے جس کا مطلب ظاہر ہے کہ عوام نے ان پالیسیوں کو مسترد کر دیا ہے اور وہ ان میں جوہری تبدیلیوں کے خواہاں ہیں، اس لیے اس مرحلے میں سابقہ حکومت کی پالیسیوں کا تسلسل جاری رکھنے کی کوششیں الیکشن کے نتائج اور ملک کی رائے عامہ کے اجتماعی فیصلے کو مسترد کرنے کے مترادف ہوں گی۔ ایسی کوششوں کو آگے بڑھانے میں سب سے زیادہ افسوس ناک کردار امریکہ سمیت ان مغربی ممالک اور حکومتوں کا دکھائی دے رہا ہے جو مشرف حکومت کی پالیسیوں کو بچانے کے لیے منتخب سیاسی پارٹیوں کی لیڈر شپ پر دباؤ ڈال رہی ہیں اور اگر خدانخواستہ یہ کوششیں کامیاب ہوگئیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پاکستان میں ۱۸ر فروری کے انتخابات کا ڈول صرف چہروں کی تبدیلی کے لیے ڈالا گیا تھا اور قومی پالیسیوں کے حوالے سے پاکستان کے عوام کی رائے کو کوئی حیثیت نہیں دی جا رہی جو انتہائی افسوس ناک اور مایوس کن بات ہوگی۔ اس لیے ان انتخابات میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والی سیاسی جماعتوں کی قیادتوں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور یہ ان کی سیاسی فراست، حب الوطنی اور حوصلہ و تدبر کا امتحان ہے کہ وہ اس الیکشن کے نتیجے میں صرف چہروں کی تبدیلی اور حکومتی مناصب پر اکتفا کرتی ہیں یا عوامی رائے اور رجحانات کا احترام کرتے ہوئے سابقہ حکومت کی ان پالیسیوں کو تبدیل کرنے میں بھی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتی ہیں جن پر نہ صرف یہ کہ عوام کی ایک بڑی اکثریت نے انتخابات میں عدم اعتماد کر دیا ہے بلکہ لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نے ان پالیسیوں کے ساتھ شدید نفرت کی وجہ سے پولنگ اسٹیشنوں تک آنا بھی گوارا نہیں کیا۔

ہمارے ہاں سیاسی عمل اور ووٹ کے ذریعے تبدیلی کے طریق کار پر لوگوں کا اعتماد پہلے ہی کم ہوتا جا رہا ہے جو ۱۸ر فروری کے انتخابات میں ڈالے جانے والے ووٹوں کے تناسب سے واضح طور

پر محسوس کیا جا رہا ہے اور اگر ووٹ ڈالنے والوں کا اعتماد بھی اس عمل پر باقی نہ رہا تو سیاسی عمل کی افادیت سے عام لوگوں کی یہ مایوسی شدید ردعمل کا باعث بھی بن سکتی ہے جس کا ان نازک حالات میں ہمارا ملک متحمل نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں امید ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان مسلم لیگ (نواز گروپ) اور دوسری بڑی سیاسی جماعتیں اس مرحلے پر ذمہ داری اور سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عوامی رجحانات کی پاس داری کے لیے موثر کردار ادا کریں گی اور جمہوری عمل کو مایوسی اور تذبذب کی دلدل کی طرف دھکیلنے کی بجائے امید اور حوصلہ افزائی کی شاہراہ پر گامزن کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی کہ قوم کے بہتر اور روشن مستقبل کی طرف یہی راستہ جاتا ہے۔

اس موقع پر ہم متحدہ مجلس عمل کے بارے میں بھی کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ پانچ سال قبل ہونے والے عام انتخابات میں دینی جماعتوں کے اس متحدہ محاذ نے جو پیش رفت کی تھی، اس سے ملک میں نفاذ اسلام اور دینی اقدار کے تحفظ و فروغ کے حوالے سے امید کی ایک کرن ذہنوں میں نمودار ہونے لگی تھی اور عوام یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ پاکستان جس مقصد کے لیے وجود میں آیا تھا، اس کی تکمیل کا کوئی راستہ اب نکل آئے گا، لیکن حالیہ الیکشن سے قبل متحدہ مجلس عمل کے باہمی خلفشار اور الیکشن میں اس کی پسپائی نے امید کی اس شمع کو گل کر دیا ہے اور قومی سیاست میں دینی حلقوں کا کردار پھر ایک بار سوالیہ نشان بنتا جا رہا ہے۔

۲۰۰۲ء کے انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کی نمایاں کامیابی کے اسباب ہمارے خیال میں یہ تھے:

☆ یہ مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والی دینی سیاسی جماعتوں کا متحدہ محاذ تھا اور پاکستان کی تاریخ بتاتی ہے کہ دینی جماعتوں نے جب بھی مسلکی دائروں سے بالاتر ہو کر دینی و قومی مقاصد کے لیے جدوجہد کی ہے، ملک کے عوام نے ان کا ساتھ دینے میں بخل سے کام نہیں لیا۔

☆ افغانستان پر امریکی اتحاد کی فوج کشی اور طالبان حکومت کے جبری خاتمہ نے پاکستانی عوام کے دینی جذبات میں ہلچل پیدا کر دی تھی جس کا براہ راست فائدہ دینی جماعتوں کے اس

متحدہ محاذ کو ہوا۔

☆ مغرب کی فکری یلغار اور اسلامی اقدار کے خلاف مغربی لابیوں کی طوفانی پیش قدمی میں پاکستانی عوام یہ امید کر رہے تھے کہ اس کی روک تھام کے لیے متحدہ مجلس عمل کوئی بھرپور کردار ادا کر سکے گی۔

اس پس منظر میں عوام کی ایک بڑی تعداد نے متحدہ مجلس عمل کا ساتھ دیا اور قومی اسمبلی اور سینٹ میں معقول نمائندگی کے ساتھ ساتھ صوبہ سرحد کی حکومت اور بلوچستان کی حکومت میں اشتراک ایم ایم اے کے حصے میں آیا جس سے عوام کو حوصلہ ہوا کہ ان کے امریکہ مخالف جذبات اور نفاذ اسلام کی خواہش کو اچھی ترجمانی میسر آ گئی ہے، لیکن متحدہ مجلس عمل اپنے پانچ سالہ دور میں عوام کی توقعات اور امیدوں کا ساتھ نہیں دے سکی۔ اس سلسلے میں معترضین کی شکایات کی فہرست طویل ہے، لیکن چند امور ان میں ایسے ہیں جن پر سنجیدہ توجہ دینے کی ضرورت ہے:

☆ باجوڑ کے دینی مدرسہ پر امریکی بمباری کے موقع پر ملک بھر کے دینی حلقے بجا طور پر یہ توقع کر رہے تھے کہ صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت اور متحدہ مجلس عمل کی قیادت عوام کی احتجاجی لہر کی قیادت کرے گی، مگر ایم ایم اے نے عوامی احتجاج کی قیادت پر اپنی حکومت کے تحفظ کو ترجیح دی جس سے دینی حلقوں کے جذبات کو دھچکا لگا۔

☆ حدود آرڈیننس کے بارے میں وفاقی حکومت کے عزائم سب پر واضح تھے اور اس نے حدود شرعیہ کا تیا پانچہ کر دیا، مگر متحدہ مجلس عمل کا کردار اس میں یہ رہا کہ نہ تو وہ خود اس سلسلے میں اپنے بلند بانگ دعووں کو عملی جامہ پہنا سکی اور نہ ہی اس نے اس کے لیے کوئی دوسرا احتجاجی فورم وجود میں آنے دیا، حتیٰ کہ ''مجلس تحفظ حدود شرعیہ پاکستان'' کے عنوان سے ایک احتجاجی فورم تشکیل پاتے پاتے رہ گیا اور اس کے تشکیل نہ پا سکنے کی بنیادی وجہ ایم ایم اے کی قیادت کا طرز عمل تھا۔

☆ لال مسجد کے سانحہ میں بھی متحدہ مجلس عمل سے جس کردار کی توقع ملک کے عوام اور خاص طور پر دینی حلقے بجا طور پر رکھتے تھے، ایم ایم اے کی قیادت نے خود کو اس کردار سے دور رکھا۔

اس سلسلے میں عوامی جذبات اور احتجاج کی قیادت کرنا اور اسے صحیح رخ پر رکھتے ہوئے موثر بنانا بنیادی طور پر متحدہ مجلس عمل کی ذمہ داری تھی، لیکن ایم ایم اے کی قیادت کی ترجیحات میں یہ ذمہ داری اپنی جگہ نہ بنا سکی جس کا خمیازہ اپنے دائرے میں تھوڑا بہت کردار ادا کرنے والے وفاق المدارس العربیہ کو بھگتنا پڑا اور لوگوں کے جذبات کی شدت کا رخ اس کی طرف مڑ گیا حالانکہ کوئی احتجاجی تحریک سرے سے وفاق المدارس کے دائرۂ کار میں ہی شامل نہیں تھی اور نہ ہی یہ اس کی ذمہ داری بنتی تھی۔

☆ متحدہ مجلس عمل کی قیادت سے لوگوں کو یہ توقع تھی کہ وہ اپنے دائرے میں ملک کے ان دیگر دینی حلقوں کو بھی شامل کرنے کا راستہ اختیار کرے گی جو دینی وملی مقاصد میں اس کا ساتھ دے سکتے ہیں اور اس طرح یہ متحدہ محاذ زیادہ موثر حیثیت حاصل کرے گا، لیکن ایم ایم اے سے باہر کے دینی حلقوں کو اعتماد میں لینے کی بجائے خود اس کے داخلی حلقوں کا باہمی اعتماد بھی مسلسل سکڑنے لگا جو پہلے دو جماعتوں (جمعیۃ علمائے اسلام اور جماعت اسلامی) کے دائرے تک محدود ہوا اور پھر ان دونوں میں ایک دوسرے پر بالادستی حاصل کرنے کی کشمکش نے الیکشن سے قبل متحدہ مجلس عمل کا شیرازہ مکمل طور پر بکھیر کر رکھ دیا۔ ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ اگر جمعیۃ علمائے اسلام اور جماعت اسلامی ہی ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کی بجائے باہمی اعتماد کے ساتھ حالیہ الیکشن میں کوئی مشترکہ موقف اختیار کر لیتیں تو صورت حال اس قدر خراب نہ ہوتی۔

☆ اس سب کچھ کے باوجود بلوچستان کی حد تک ہمیں یہ توقع تھی کہ جمعیۃ علمائے اسلام ان انتخابات میں پہلے سے زیادہ اچھی پوزیشن حاصل کر لے گی اور متحدہ مجلس عمل کا صف اول کا سیاسی کردار باقی رہ جائے گا مگر وہاں بھی جمعیۃ علمائے اسلام میں پیدا ہو جانے والے باہمی خلفشار پر حکمت عملی کے ساتھ قابو پانے کی بجائے دستوری موشگافیوں کو ترجیح دی گئی جس سے سیاسی عمل میں جمعیۃ کی مزید پیش رفت کا خواب بکھر کر رہ گیا۔

ان حالات میں متحدہ مجلس عمل کے گزشتہ پانچ سالہ سیاسی کردار پر ایک حد تک مایوسی کا اظہار

کرنے کے باوجود بھی ہماری شدید خواہش ہے کہ ایم ایم اے کا فورم قائم رہے اور وہ مذکورہ بالا شکایات کا ازالہ کرتے ہوئے مستقبل کے سیاسی سفر میں باہمی اشتراک وتعاون کو جاری رکھنے کا اہتمام کرے۔

ہمیں متحدہ مجلس عمل سے یہ شکایت نہیں ہے کہ وہ اپنے حکومتی دائرے میں نفاذ اسلام کا اہتمام کیوں نہیں کرسکی، کیونکہ ہم بخوبی یہ بات سمجھتے ہیں کہ موجودہ حکومتی نیٹ ورک میں ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے جس کی تصدیق حسبہ بل کے ساتھ وفاقی دارالحکومت کی طرف سے روا رکھے جانے والے طرز عمل نے کردی ہے، البتہ ہم اس شکایت کو بے جا نہیں سمجھتے کہ عوام کے دینی جذبات کی ترجمانی، دینی حلقوں کے درمیان مفاہمت وتعاون کو وسعت دینے اور ان کی احتجاجی قوت کو منظم واستعمال کرنے کے لیے متحدہ مجلس عمل جو کچھ کرسکتی تھی اور جو کچھ اسے کرنا چاہیے تھا، وہ نہیں ہوا اور متحدہ مجلس عمل کی پالیسی ترجیحات میں آہستہ آہستہ معروضی اور روایتی سیاست کا غلبہ ہوتا چلا گیا۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر متحدہ مجلس عمل اور دینی جماعتوں نے بھی معروضی سیاست ہی کو اوڑھنا بچھونا بنانا ہے تو اس کے لیے دوسری روایتی سیاسی جماعتیں ہی کافی ہیں اور وہ ان سے زیادہ اچھے انداز میں معروضی سیاست کے تقاضے پورے کر رہی ہیں۔ دینی جماعتوں کا اصل اور امتیازی کردار ہمارے نزدیک یہ ہے کہ وہ معروضی سیاست میں صرف اس حد تک ملوث ہوں جتنا نظریاتی اور دینی مقاصد کے لیے ناگزیر حد تک ضروری ہو۔ وہ اسے اساس بنا کر موجودہ عالمی اور قومی تناظر میں دینی اقدار کے تحفظ وفروغ اور نفاذ اسلام کے لیے پیش رفت کا راستہ نکالیں اور اس سلسلے میں عوامی احتجاج کی قیادت کریں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر اب بھی متحدہ مجلس عمل کے قائدین ایک بار پھر مل بیٹھیں اور گزشتہ کوتاہیوں کا احساس وادراک کرتے ہوئے باہمی مفاہمت واعتماد کے ساتھ آگے بڑھنے کا راستہ اختیار کرلیں تو بہت سی باتوں کی تلافی ہوسکتی ہے اور قومی سیاست میں دینی جماعتوں کے کردار کو موثر بنانے کے راستے نکل سکتے ہیں۔ خدا کرے کہ ہماری یہ گزارشات متحدہ مجلس عمل کے قائدین کے اذہان وقلوب تک رسائی حاصل کر پائیں اور دینی جدوجہد کے از سر نو منظم ہونے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے، آمین یارب العالمین۔

(۲۳ فروری ۲۰۰۷ء)